مجموعی کاروائی

مصنف :- اختر (چودھری)

عنوان :-

ترتیب :-

ادھو ناول

(نقل [illegible] حق)

افسانہ
آزادیٔ ہند

چودھری افضل حق (احرار)

تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور

آزاد ہند پریس ہسپتال روڈ لاہور میں شیخ عنایت اللہ پرنٹر و پبلیشر نے تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور کیلئے چھپوائی

بابِ اوّل

مُلاقات

محبُوب کی نیند میں ڈوبی ہُوئی انگڑائیوں کی طرح موسمِ بہار کی شفق نے حسین شام کو اور بھی رنگین بنا دیا تھا۔ زرّیں پر طیُور کنارۂ دجلہ پر سبز پتّوں کے بوجھ سے جُھکی ڈالیوں پر بیٹھے محبت کے الوداعی راگ گا رہے تھے۔ نغمے دریا کی موجوں میں بہے جاتے تھے محسن پُل کے قریب پھُولوں سے لدی سبز جھاڑیوں کی اوٹ میں پتّھر پہ بیٹھا تصوّرات کی دُنیا میں مُسکرا رہا تھا۔ اچانک اُس نے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سُنی۔ دیکھا کہ ایک شعلہ رُو حسینہ سفید گھوڑے سے جس پر زرّیں زین کسی تھی، اُتری۔ باگیں گردن پر ڈالیں۔ گھوڑے کو تھپکی دی۔ جانور وفادار مُلازم کی طرح وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔ اور وہ گلشنِ خُوبی سیرِ دریا سے لُطف اندوز ہونے لگی۔ اس کے سیاہ لمبے بال خوبصورت سُرخ فیتے سے بندھے تھے۔ اس کی رنگین ریشمی ساڑھی جس پر آسمانی رنگ کی

کی تیتریاں بنی ہوئی تھیں۔ جب ہوا کے جھونکوں سے اُڑتی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ حسین تیتری خود مائل پرواز ہے۔ مُحسن حسنِ تنہا خرام کے جمال کی تابندگی میں گم ہوگیا۔ لہریں دریا کے سینہ سے اُٹھ کر ساحل سے ٹکرا کر واپس ہو جاتی تھیں۔ وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ آہستہ آہستہ پُل کی طرف آئی۔ اچانک اس کی نظر مُحسن پر پڑی۔ دونوں کی نظریں مل کر جھکیں جھک کر ملیں۔ مشرق کی روایتی دوشیزہ کی طرح اُس نے شرما لجا اور سمٹ سمٹا کر نامحرم کی نگاہ سے بچنے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ متانت مآب حسینہ بغیر گھبراہٹ کے مڑ کر آہستہ آہستہ گھوڑے کی طرف بڑھی۔ گھوڑا محبوب مالکہ کے قرب سے کلیلیں کرنے لگا۔ وہ چابکدست سوار کی طرح رکاب میں پاؤں ڈالکر پُھرتی سے زین پر ڈٹ کر بیٹھ گئی۔ باگیں اُٹھائیں جانور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ حسین سوار کا خوبصورت جانور بانکپن سے قدم اُٹھاتا چلا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔ پھر دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔ اسی ہیر پھیر میں گویا منٹوں کے اندر بہار اور خزاں کے کئی موسم آنکھوں کے سامنے سے گذر ے۔ وہ جا رہی تھی۔ یہ حسین نظارہ صبح کے خوشگوار خواب کی طرح ختم ہو رہا تھا۔ خودرَو درختوں کے سبز جُھنڈ کے پیچھے وہ جاتے جاتے اوجھل ہوگئی۔ محبّت کے ترکش

کا پہلا تیر کھا کر محسن کی آنکھوں کے سامنے کالے ناگ لہرانے لگے۔ پہاڑ کی بلندی اور دامنِ کوہ کے چراگاہوں پر تاریکی کا غلبہ بڑھ رہا تھا۔ رنگین پر طائر سبز درختوں میں بسیرا ڈھونڈ رہے تھے۔ محسن اس خوش جمال کے حسین تصوّر میں کھویا کھویا شہر کو واپس جا رہا تھا۔

آشنائی سے جُدائی کتنی مشکل ہے۔ رات کالی بلا بن گئی محسن نے عراقی ہوٹل کے کمرے میں کروٹ پر کروٹ بدلی۔ برہ کی ماری کوئل کی طرح آہیں بھرنے لگا۔ جو سکوتِ نیم شبی میں دُور تک سُنائی دیں۔ رات یوں آنکھوں میں کاٹ کر وہ صبح کے قریب سو گیا۔ خواب نے پھر اس حسین حقیقت کی طرف ذہن منتقل کر دیا۔ جس کے ایک جلوہ پر اپنی باقی زندگی کی مسرتیں قربان کرنا چاہتا تھا۔ خواب میں پھر وہ دل آویز منظر سامنے آ گیا۔ وہ کنارۂ دجلہ پر پُل کے قریب چشم براہ بیٹھا ہے۔ سبز درختوں کے جُھنڈ اور نوخیز جھاڑیوں کی اوٹ سے حسینہ خراماں خراماں آتی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھوں میں تازہ پھُولوں کا ہار اور چہرہ پر شوقِ محبت ہویدا تھا۔ وہ قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ دُنیا کی شیریں ادائیں جمع کر کے پریت اور پیار کی زبان سے کہا محسن تم یہاں میرے انتظار میں کب سے بیٹھے ہو؟

ہَیں ترے انتظار میں؟

محسن کے لہجہ میں بے پایاں حقارت کے جذبات موجود تھے۔
نازنین کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس کا رنگ زرد ہوگیا اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں۔

اُس نے محبت بھری آواز میں کہا تم ناراض ہوگئے محسن؟

اُس نے کوئی جواب نہ پایا۔ مجبوب سے مایوسی اُٹھا کر کچھ دیر بے معنی کان کھجلاتی رہی۔ پھر واپس لوٹی۔ چند قدم چل کر پھر آئی اور عجز سے ہار آگے کر کے انکسار سے بولی محبت کا یہ حقیر نذرانہ قبول نہ کرو گے محسن؟

جوابِ باصواب کے بجائے شکوہ سُنا کہ تری پازیب کی جھنکار میری برہمیِ مزاج کا باعث ہے۔

حسینہ نے بے ساختہ کہا۔ مَیں پازیب نہ پہنوں گی محسن!

"مُجھے تیرا یہ لباس پسند نہیں"

"مَیں تیری پسند کے مطابق لباس بنواؤں گی"

"مجھے پھر بھی تیری محبت قابلِ قبول نہیں"

حسینہ کے ہاتھوں سے پھول والا چھوٹ گیا۔ کھڑی کھڑی آنسوؤں کے ہار پرونے لگی۔

مایوسِ محبت عورت کی تُرکش تدبیر کا آخری تیر یہ ہے کہ وہ گلے میں

ہاتھ حمائل کر کے اپنے رُوٹھے محبُوب کو مناتی ہے۔ نازنین نے ایسا ہی کیا۔ لیکن محسن نے پھر بھی اس کو جھڑک دیا اور جھٹکا دیا۔

محسن، اس جھٹکے سے خواب سے بیدار ہو گیا اور شُومیٔ قسمت پر رویا۔ محبُوب کو یُوں کھو کر کون رویا نہیں کرتا۔

وہ امید و انتظار میں دجلہ کے کنارے پہروں بیٹھا رہتا۔ موتی تو گہرے پانی میں قسمت سے ہاتھ آتے ہیں۔ دریا کے کنارے بیٹھے دُرِ بے بہا کیونکر ملتا۔ وہ اِس سمت اور ان راستوں کی طرف اچانک ملاقات کی امید پر بار بار جاتا تھا۔ اس کے لئے دُنیا دلچسپیوں سے خالی تھی۔ نہ زرّیں شفق میں دل آویزی، نہ خندۂ صبح میں مسرت، اُودی گھٹائیں، خوشبوؤں سے لدی ہوائیں، دل نشین نغمے، کُچھ کشش نہ رکھتے تھے۔ موسمِ گُل میں جس کے سینہ میں داغِ حسرت ہو۔ گلزار بھی اس کی نگاہ میں خارزار سے کم نہیں ہوتے۔ اگر اس کے پسند خاطر کوئی چیز تھی، تو وہی راہ اور روش، جس سے وہ واپس لوٹی تھی۔

ایک شام محسن دجلہ کے اُسی پل پر جو ہزاروں جلوؤں کی جنت گاہ ہے بیٹھا تھا۔ قدرت کے حسیں ترین مناظر گرد و پیش تھے مگر اس کی نگاہیں اُسی درختوں کے جُھنڈ کی طرف تھیں جس کی اوٹ میں ہو کر وہ نظر سے اوجھل ہو گئی تھی۔ پانی کے دھارے کے ساتھ ساتھ ایک

خوبصورت کشتی آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی۔ اس میں ایک خوش جمال دوشیزہ ایرانی لباس میں، حنا بستہ ہاتھوں میں رنگین چپّو لئے بیٹھی تھی۔ پُل کے قریب پہنچ کر اس نے جھمک جھجک کر محسن پر نگاہ ڈالی اور پھر تیزی سے چپّو چلا کر تیر کی طرح سامنے سے نکل گئی۔ محسن کو گویا کھویا ہوُا لعل مل گیا۔ وہ تصوّر سے چونکا اور منہ سے بے ساختہ "وہی" نکل گیا۔ حسینہ نے جاتے جاتے نگاہِ غلط انداز سے دیکھا۔ وہ اس کی سراسیگی سے محظوظ ہو کر مُسکرائی۔ محسن کے دل پر بجلی سی کوند گئی ۔۔ وہ پُل کے دوسری طرف کشتی کنارے لگا کر بظاہر غروب آفتاب کے دلکش نظارہ میں محو ہو گئی۔

محسن شوقِ دیدار کو چھپانے کے لئے لاپرواہی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اور اس احتیاط سے نظر چرا کر اُدھر دیکھتا تھا کہ کوئی جانے اسے کسی کی پرواہی نہیں۔ دونوں طرف ہی احتیاط کے تقاضوں پر عمل ہو رہا تھا۔ سُورج غروب ہو گیا۔ بادلوں پر رنگ باقی تھا۔ حسینہ چپّو سنبھال کر کشتی میں بیٹھ گئی۔ اُلٹے پانی جانا کتنا مشکل ہے مگر محفوظ جوانی اِس مشکل کو آسان کر رہی تھی۔ اور وہ کمال بے تکلفی سے کشتی چلاتی واپس لَوٹی۔ آج اِس بے نشان کا نشان ڈھونڈنا مشکل نہ تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کشتی چلا رہی تھی محسن بھی آہستہ آہستہ کنارۂ دریا کے درختوں

اور جھاڑیوں کے اوٹ میں آرہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے اوجھل ہونے اور نہ ہونے کی کوشش میں تھے۔ آفتاب غروب ہو گیا۔ مہتاب نے دنیا کو سفید ردا پہنادی۔ دریا کا پانی چاندی کا دھارا معلوم ہونے لگا۔ کائنات پر نیا حُسن چھا گیا۔ اس حسین کشتی بان نے خوبصورت ماحول سے متاثر ہو کر حبِ وطن سے مملو پاکیزہ راگ گایا۔ اور خود چپوؤں کو چلاتی اور جھُوم جھُوم جاتی تھی۔ آواز میں لوچ اور سوز کا یہ عالم تھا کہ تمام عالم عالمِ وجد میں معلوم ہوتا تھا۔ میٹھے اور درد بھرے راگ کی صدائے بازگشت ساتھ کی پہاڑیوں سے یوں آتی تھی۔ گویا پتھروں کے سینے سے درد و کرب کی آہ اُٹھ رہی تھی

"وطنِ عزیز تجھ سے بچھڑے ہوئے برسوں ہوئے۔ مگر تیری یاد اب بھی تازہ ہے

ہندوستان جنت نشان تیری آبادیاں دوزخ سے بدتر کیوں ہو گئیں۔

اور ملک خوش حال ہیں لیکن سونے کی کان ہند تو کیوں افلاس کا گہوارہ ہے،

اے خدا ہندوستان کے باشندے مصیبت میں کیوں مبتلا ہیں

دوسروں کے تابع فرمان ہو کر رہنا میرے ہی اہلِ وطن کی قسمت میں کیوں لکھا ہے،

ہندوستان کی فاقہ مست عورتیں حسن سے خالی اور جوان صحت سے عاری ہیں

ہمارے گھر مسرتوں سے محروم ہیں بچے بھوک سے بیتاب ہیں۔

سب کے نگہبان خدا ہماری طرف دیکھ! ہم دنیا میں سب سے دکھی ہیں"

یہ ہندوستانی خیال عربی لَے میں گایا گیا۔ معلوم ہوا کہ کائنات کا قلب حرکت سے محروم ہو گیا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹا چھا گیا۔ پھر یک بیک چپوؤں کی آواز تیز ہو گئی۔ وہ سُرعت سے جا رہی تھی۔ ایک مقام پر کنارہ دریا کے درخت پانی پر گھنا سایہ ڈال رہے تھے۔ اسی سایہ میں ایک کشتی بندھی تھی۔ دو شخصوں نے جلدی سے آکر کشتی کو کھولا اور اُس پر جھٹ سے سوار ہو کر منجدھار میں آکر ٹھہر گئے۔ حسینہ نے کشتی کو کنارے لگایا اور اُتر کر ساحل پر کھڑی ہو گئی۔ کشتی کے دوسرے دونوں سوار بھی اسی کنارے اُترے۔ محسن سمجھا کہ محبوب کے ملاقاتی ہیں۔ گو سانپ سینے پر لوٹ گیا، لیکن محبت کی سرگوشیوں میں مخل ہونا قرینِ شرافت نہ سمجھ کر وہ لوٹا چاہتا تھا کہ لفظی تکرار اور عورت سے ہاتھا پائی شروع دیکھی۔ ٹھہرو! عورت نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ مجھے سب سے محبت ہے اور میری محبت کے دروازے بھی سب پر کُھلے ہیں۔ میرا باپ میری شادی کی شرائط کا اعلان کرنے والا ہے۔ اِن شرائط کو پُورا کرنے والا مجھے باندی بنا سکتا ہے۔ عورت پر زور آزمائی محض کمینوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ شرافت کے ساتھ میرے باپ کی شرائط پُوری کرو اور میری محبّت ہمیشہ کے لئے بیع کرا لو۔

لیکن آنے والوں نے بولو مت کہا اور عورت کو زبردستی اُٹھانے کی کوشش کی محسن جھاڑیوں سے تیر کی طرح نکلا چشم زدن میں فریقین میں حائل ہو گیا۔

حسینہ نے متانت سے کہا ٹھہرو، نوجوان! مجھے اپنا جھگڑا خود چکانا چاہئے۔ تف ہے اس عورت پر جو اپنی عصمت کی حفاظت کا سامان ہر وقت پاس نہیں رکھتی۔ اُس نے زیر آستین ایک خوبصورت خنجر نکالا اور دوسرے ہاتھ میں ہیرے کی کنی دکھائی۔ دشمن پر میں اس سے فتح پاؤں گی۔ یا خود یہ کھا کر مر جاؤں گی۔ چمکتے خنجر کی دھار دیکھ کر اِن نامردوں کا زہرہ آب آب ہو گیا اور کھسیانے ہو کر کھسکنے لگے۔

نازنین نے امتنان و تشکر کا ایک کلمہ کہے بغیر محسن کی عبا کا کنارہ ہلکے سے کھینچا۔ خود کشتی میں جو کنارے کنارے بہی جاتی تھی بیٹھ گئی۔ محسن اُس کے پیغامِ محبّت کو نہ سمجھ کر اسی جگہ کھڑا رہا۔ وہ کشتی قریب لے آئی اور رُک گئی۔ دونوں نیچی نظریں کر کے ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ چپّو چلنے بند تھے۔ کشتی آہستہ آہستہ دریا کے کنارے بہنے لگی۔ محب اور محبوب میں پاٹ بڑھنے لگا۔ وہ پھر سنبھلی اور چپّو چلانے لگی۔ قریب آ کر نرگسی آنکھوں سے اسے اشارہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ محبوب کی آنکھ کا محبّت بھرا پہلا اشارہ دل کی دُنیا

پر جنّت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس کا دماغ آسمان پر تھا اور پاؤں کشتی میں۔ وہ آہستہ سے نزدیک بیٹھ گیا۔ وہ بھی کشتی کو کھینے لگی اور نگاہِ غلط انداز سے کبھی کبھی دیکھتی جاتی تھی۔

چودھویں کے چاند میں محبوب کے ساتھ پانی کی پُرسکون سطح کی سیر شاعر کا حسین ترین تخیل ہے۔ مشرق کے بہترین شاعر نے ان شیریں لمحوں کا ذکر شوق سے کیا ہے۔ یہ دونوں اس وقت مشرق کی شاعری کا حسین عنوان اور شاعر کے بلند ترین تخیّل کی مجسم حقیقت بنے جا رہے تھے۔ عطر بیز ہواؤں کے خوشگوار جھونکے انہیں پے بہ پے متوالا بنا رہے تھے۔ مئے محبت سے سرشار وہ خوشیوں کے بحرِ ناپیدا کنار میں بہے جاتے تھے۔ حسینہ نے اچانک ہاتھ روک کر کہا۔ آبادی یہاں سے قریب ہے میرے محسن!

ہر چند لفظ "محسن" اس کے عمل کے اعتبار سے استعمال ہوا تھا۔ مگر محبوب کی زبان پر پہلی دفعہ اپنا نام سُن کر وہ محبت کی بے پایانیوں میں اَور بھی کھو گیا۔

"محسن! تمہاری منزلِ مقصود پوچھ سکتی ہوں"

"مَیں مسافر ہُوں۔ ہوٹل میں مقیم ہُوں"

"کیا تم میرے باپ سے نہیں مل سکتے؟"

"بشرطیکہ میری ہم رکابی بارِ خاطر نہ ہو"
حسینہ نے آنکھیں جھکالیں

بغداد برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنا ہُوا تھا۔ نزدیک سے نزدیک تر ہوتا گیا۔ سربفلک عمارتیں صاف دکھائی دینے لگیں۔ شہر کے قریب اور بھی جوان جوڑے چاند کی چاندنی میں چھوٹے چھوٹے بجروں پر خوش وقت ہو رہے تھے۔ ایک معلوم مقام پر حسینہ نے کشتی کو روک کر باندھا۔ دونوں بغداد کے بڑے بازار میں داخل ہُوئے۔ حسینہ رہنمائی کرتی ہوئی چلی۔ وہ حسین تھی اور عفت مآب ایسی کہ فرشتے اس کے دامن پر نماز پڑھنے کو فخر سمجھیں۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ کسی نوجوان کے ہمراہ دیکھی گئی۔ نظریں اس کی طرف اٹھتی تھیں۔ لیکن وہ گناہ کے تصوّر سے دُور تھی۔ اس لئے پہلی سی بے تکلفی سے جارہی تھی۔ شہر سے گذر کر آبادی کے کچھ فاصلہ پر ایک شاہانہ مکان میں داخل ہوئی۔ عمارت کے گرد ایک وسیع باغ تھا اور باغ کے مرکز میں ایک خوبصورت تالاب تھا۔ جس میں فوّارے موتیوں کا مینہ برسا رہے تھے۔ تالاب کے کنارے پر مرمریں چبوترہ تھا۔ کرسیاں بچھی تھیں۔ ہاتھوں کے اشارے اور سر کی جنبش کی دلفریب ادا سے بیٹھنے کا اشارہ کر کے چلی گئی۔ اور کچھ دیر بعد ایک سجیلے نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر والہانہ

اظہارِ محبت کرتی ہُوئی لَوٹی ۔ گو اس کی محبت پر محسن کا کوئی استحقاق نہ تھا ۔ مگر فطرتِ انسانی کی کمزوری سے مجبور ہو گیا ۔ اور نوجوان کے ساتھ اُس کی بے تکلفی کو برداشت نہ کر سکا ۔ جی نے چاہا کہ اس آتشکدۂ رقابت سے بھاگ جائے ۔ مگر وہ آ ہی پہنچے ۔ آنے والے نوجوان کی آنکھوں میں شرافت اور چہرے پر معصوم بشاشت تھی ۔ اُس نے شریف مہمان کو محسن کہہ کر گلے لگایا ۔ اور بزرگوں کی طرح پیار کیا ۔ اور کہا کہ میرا نام سلطان المعظم ہے ۔ اور یہ میری اکلوتی بیٹی نیلوفر ہے ۔

بیٹی ؟ محسن نے ٹھٹک کر کہا ۔

اس کی گھبراہٹ کا مطلب معلوم کر کے بیٹی نے باپ کی طرف اور باپ نے بیٹی کی طرف محبت سے دیکھا اور پھر دونوں مُسکرا دیئے ۔ حسینہ کے باپ نے تپاک سے محسن کا ہاتھ کھینچتے ہُوئے کہا ۔ کہ میرے عزیز مہمان صحت اور عمر کا ظاہری فرق تمہاری حیرت کا باعث ہے ۔ محفوظ زندگی اور باقاعدہ ورزش مجھے سدا بہار پھول بنائے ہوئے ہے ۔ اور مَیں ۴۵ برس کی عمر میں ۲۵ سال کا جوان ہُوں ۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا ۔ مَیں کن الفاظ میں امتنان و تشکر کا اظہار کروں ۔

محسن نے کہا ، ادائیگی فرض تشکر کی مستحق نہیں ۔

سُلطانِ معظّم حقیقت میں یہ سچ ہے۔ مگر رسمِ دنیا یہی ہے کیونکہ احساسِ فرض ہمارے ملکوں میں مفقُود ہے۔

"اس ذکر کو طول دے کر شرمندہ نہ کریں"

"بہتر معزز مہمان۔ کیا میں تعارف کا شرف حاصل کر سکتا ہوں"

"میرا نام محسن ہے۔ ماژندران کے سردار کا بیٹا ہوں۔ ۱۲ برس کی عمر کے بعد خاندانی رسم و رواج کے مطابق وسیع دنیا میں تھوڑا تجربہ حاصل کرنے کے لئے نکلا ہُوں۔ بغداد جو تہذیب اسلامی کا گہوارہ رہا ہے، میرے شوق کا مرکز تھا۔ سیدھا یہیں چلا آیا۔ عراقی ہوٹل میں مقیم ہوں۔ دجلہ کا کنارہ کئی دنوں سے میری محبوب سیرگاہ تھا۔ حسبِ معمول میں مصروفِ تفریح تھا کہ یہ رنج دہ منظر دیکھا۔

سلطان المعظم نے کہا محسن بغداد میری بھی خوشگوار خوابوں کا محل رہا ہے۔ غلام آبادِ ہند سے جب جی اکتا گیا تو اسی جگہ چلا آیا۔ کل اگر غریب خانہ پر چائے کی دعوت قبول ہو تو اپنے خاندان کی دلچسپ داستان سناؤں۔ یہ ملاقات تعلقات کی سنواری کا باعث ہو گی۔

دعوتِ چاء شربتِ دیدار کا ذریعہ تھی۔ اس لئے انکار نہ کر سکا۔ ایک طرف پاسِ ادب اور دوسری طرف رعبِ حسن کے باعث پھُول

سے خوبصورت اور شبنم سے پاکیزہ محبوب کی طرف بغیر آنکھ اُٹھائے الوداع کہی اور ہوٹل کو لوٹا۔

اوباشوں کا حملہ اور محسن کا درمیان حائل ہونا محبوب کی ملاقات اور تعلقات کیلئے قدرت نے ایک معقول سفارش پیدا کر دی تھی۔ وہ سارا راستہ خدا کی حمد و ثنا میں مصروف چلا آیا۔ وہ ہوٹل میں کھانا کھا کر پھر شہر کے باہر آگیا۔ حسنِ رنگیں کے جلوے آنکھوں میں سمائے تھے۔ اس لئے کائنات حسین نظر آتی تھی۔ چاندنی میں زرخیز کھیتوں کو دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔ بڑی رات گئی واپس آیا۔ خوشی اور غم اعصاب پر دونوں اثر رکھتے ہیں۔ پہلی رات غمِ فراق سے نیند نہ آتی تھی۔ آج ملاقات کی مسرت سے خواب حرام ہو رہی تھی۔ اس لئے باقی رات بھی کچھ سوتے کچھ جاگتے کٹ گئی۔ مرغِ سحر نے دردِ فراق سے بیتاب ہو کر اذانِ عشق دی۔ محسن بستر سے اُٹھ بیٹھا۔ لباس کی موزونیت پر غور کرنے لگا۔ کچھ غور کچھ فکر کچھ انتظام کچھ اہتمام میں وقت بسر کر کے دعوتِ چاء پر چل دیا۔ دل بدستور دریا کی طرح امنڈ رہا تھا۔ ہر طرف مسرّت کی موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ قدرت کائنات کو گدگدا رہی ہے۔ اور ہر ذرہ خوشی سے چمک اُٹھا ہے۔ دماغ کو محبوب کے حسین تصوّر سے رشکِ صد گلزار بنائے وہ منزلِ مقصود

پر پہنچا۔ مُلازم آمد کا منتظر تھا۔ سینہ پر ہاتھ رکھ کر احترام سے گردن جھکائی اور رہنمائی کر کے خوشنما عمارت میں لے گیا۔ اُسے آرائشی کمرے میں آرام دہ سوفہ پر بٹھا کر چلا گیا۔ میز اور کُرسیاں قرینے سے پڑی تھیں۔ ان پر خوشنما میز پوش اور صوفوں پر بہترین قسم کے چھوٹے چھوٹے ریشمی تکیے دھرے تھے۔ جس پر خوبصورت گل بُوٹے بنے ہُوئے تھے۔ اگر کشاکشِ دنیا سے تھکا ہُوا شخص یہاں آجائے تو اس کے بیٹھتے ہی کلفت و کوفت دُور ہو جائے۔ مگر محسن یہاں بھی مضطرب تھا۔ اُس کے دل کی بے کلی سکون پذیری کے لئے کسی کے دیدار کی طالب تھی۔ مُلازم جلدی ہی واپس آگیا۔ اور سر کی جنبش اور ہاتھ کے اشارے سے پھر چلنے کو کہا۔ جوں ہی وہ برآمدے میں آئے نیلوفر سامنے بالائی منزل کی غلام گردش میں کھڑی مُسکرا رہی تھی محسن کو ایسا معلُوم ہوا جیسے سفرِ ریگستان کے بعد اچانک کسی مرغزار میں نکل آیا ہو۔ آج وہ چاندنی جُوتا اور سفید شلوار پہنے بسنتی دوپٹہ اوڑھے کھڑی تھی۔ اس کی نیچی نظریں۔ زیرِلب تبسّم دل پر رنگ برسا رہا تھا۔ وہ استقبال کی دلکش صُورت بنی تھی محُسن رُک کر اس دلفریب نظارے سے شاد کام ہونا چاہتا تھا۔ لیکن تہذیب اس طرح کھڑے ہونے کو ناشائستہ حرکت قرار دیتی تھی۔ اُس نے بظاہر لاپرواہی سے چلتے چلتے آنکھ بچا کر کئی دفعہ دیکھا۔ آنکھیں چُرا کر دیکھنے والے بھی کئی دفعہ پکڑے جاتے

ہیں۔ ملازم نے اِن دونوں کی معصوم کوششوں کو دیکھا مگر رستہ چلتا رہا۔ اُس نے ایک کمرہ کا پردہ اُٹھایا محسن جُوں ہی داخل ہُؤا رمضان المعظم نے نہایت تپاک سے خوش آمدید کہا۔ اور محبت سے لیجاکر ایک کُرسی پر بٹھایا۔ جہاں میز پر خورونوش کا سامان پہلے ہی موجُود تھا۔ حدیثِ مائدہ کے طور پر کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ آخر مہمان نے اپنا تعارف یُوں کرایا۔

دفینہ

مَیں مغل سلاطین کی ناقابلِ فخر نشانی ہوں۔ انقلابِ سلطنت کے بعد جب مَیں نے ہوش سنبھالا، تو خاندان کا شیرازہ نہ صرف بکھر چکا تھا بلکہ تن آسان شہزادوں کی دوسری نسل نانِ شبینہ سے محتاج ہو چکی تھی۔ یا تو اب مزدوری سے پیٹ پالتی تھی، یا دوسروں کی سخاوت پر بسر اوقات کرتی تھی۔ بیس برس کی عمر میں والد اچانک داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ مکتب چھوڑ کر مجھے دنیا کی درس گاہ میں آنا پڑا۔ انگریزی نظامِ حکومت میں جس کا کام چل جائے وہی ہشیار۔ مَیں دُنیا کی نظر میں بدھو قرار پایا۔ میری بدحالی سے والدہ پریشان تھی۔ طویل بیکاری نے اس کی عمر کو کوتاہ کر دیا اور وہ بسترِ مرگ پر پڑ گئی تھی اور ساتھ ہی میری شادی کے لیئے نامہ و پیام کرنے لگی۔ غرض بیوی گھر آئی۔ والدہ عدم کو چلی گئی۔

میرے سسرال بھی نام کے شہزادے تھے حقیقت میں فقرا کی طرح ان کی بھی زکوۃ پر بسر اوقات تھی جس طرح دیوالیہ ساہوکار پرانی بہیوں کو بیکاری میں مشغلہ بنالیتا ہے۔ اسی طرح میں بھی پرانے کاغذات تلاش کر کے اپنی مصروفیت کا ڈھنگ پیدا کرتا تھا۔ دیوان حافظ والدِ مرحوم کے لئے انیسِ تنہائی تھا۔ اسے قرآن کی طرح جزدان میں رکھتے تھے۔ شعر و سخن سے مجھے گھن آتی تھی۔ اس لئے دو برس سے اُسے اُٹھانے کی نوبت نہ آئی تھی اور اس پر گرد پڑی ہوئی تھی۔ ایک دن عالمِ پریشانی میں باپ کے اس محبوب مشغلہ کو اُٹھایا۔ آنکھوں میں مٹی پڑ گئی۔ خیر جھاڑ پھونک کر کھولا۔ عقیدت سے چوما۔ یوں ہی ایک ایک ورق اُٹھایا۔ میری نظر ایک حنائی کاغذ پر پڑی۔ جس پر متعدد سرخ لکیریں تھیں اور سرورق پر سیاہی سے نقشہ لکھا ہوا تھا۔ جزدان میں ہی ایک چھوٹی سی خوردبین بھی پڑی ہے۔ شاید اسی تحریر کو پڑھنے کے لئے رکھی گئی ہو۔ چنانچہ میں خوردبین کی مدد سے اس طرح پڑھنے لگا۔

تحریر

تیموریہ خاندان کی مصیبت جب حد سے بڑھ جائے۔ تو دفینہ کا استعمال جائز ہے۔ صاحب دفینہ کی خواہش بھی ہے۔ کہ جب

ہندوستان کی سلطنت تیموریوں کے ہاتھ سے نکل جائے تو ان میں وہ شخص جو اس خزانہ پر قابض ہو۔ قوموں کی ترقی اور تنزل کا رلز عمومی دریافت کر کے غلام قوموں میں اس کی اشاعت کرے۔

ستاروں کا وہ علم جو ہمیں حاصل ہے۔ اس کی بنا پر دو اہم باتوں کا انکشاف کیا جاتا ہے۔

دفینہ کو نکالنے والا پچاس برس کی عمر پائیگا۔ اور وہ اکلوتی بیٹی کا باپ ہو کر مرے گا۔ لازمی ہے کہ اس کی لڑکی کی شادی اس نوجوان سے کی جائے۔ جو صاحبِ دفینہ کے سوالات کے درست جواب حاصل کر سکے۔

سوالات

خُدا قول میں ہے یا فعل میں؟
دُنیا کو کس طرح مسخر کیا جا سکتا ہے؟
مسلمان دنیا بھر میں اقتصادی طور پر بدحال کیوں ہیں؟
اس کا حل کیا ہے؟
دنیا اور دین کے کاموں میں کامیابی کی اولین شرط کیا ہے؟
غلام ملک آزادی کیونکر حاصل کر سکتے ہیں؟

آزادی کو کیوں کر برقرار رکھ سکتے ہیں؟

ہندوستان کی آزادی میں کیا رکاوٹ ہے؟

ہندوستان کی آزادی کی آسان راہ کیا ہے؟

ممالک اسلامیہ کی گلو خلاصی کب ہو گی؟

واضح ہو کہ مفصلہ سوالات کے متعلق تاریخ سے فتویٰ پوچھا گیا۔ ممالک کے گوناگوں انقلابات کے باعث ہر سوال کے متعلق مورخین کی آرا افسوسناک طور پر مختلف پائی گئیں۔ اس لئے بعض روحانیوں کی طرف اس بارے میں رجوع کیا گیا۔ دَورِ حاضر میں سب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ہری پربت پر کوئی غیر فانی مخلوق اقامت پذیر ہے۔ وہ وسیع تجربہ کی بنا پر رہنمائی کر سکتی ہے۔

خزانہ کی دستیابی سے مَیں خوش تھا۔ لیکن شرائطِ متعلّقہ کی بابت تردّد سا پیدا ہو گیا۔ ہری پربت کی غیر فانی مخلوق کی تلاش میں میں کون کامیاب ہو کر آئے گا۔ بیوی بڑی ہوشمند تھی۔ میرے چہرے کے تغیّرات سے کیفیتِ قلب کا اندازہ کر کے بولی کہ دنیا کی کامیابی کے راستے میں مشکلات ہوتی ہیں۔ ہمت شرط ہے۔ سب سے اول اس تحریر کی صحت محلِ بحث ہے۔ ایسا قیمتی کاغذ یوں معمولی جزدانوں میں پڑا رہے۔ مَیں نے جواب دیا کہ کسی چیز کو زیرِ نظر رکھنا

بھی بہترین حفاظت ہے:-

میرے اس سوال کے جواب پر وہ قائل ہو گئی۔ میں نے ساری تحریر سنائی۔ اس کا رنگ رُو زرد ہو گیا اور بڑے تردّد سے بولی کہ دفینہ پر قابض عمر کا کوتاہ اور اولادِ نرینہ سے محروم لگتا ہے۔ اس لئے ایسے خزینہ کے حصول سے فائدہ؟ جس سے عُمر کم اور بیٹے کی مسرت سے محروم ہو جائیں:-

عورت کا دل مرد کے قلبِ حریص سے مختلف ہوتا ہے۔ خاوند کی محبت اور بیٹے کی الفت ہی اس کے لئے خوشی کا خزانہ ہے۔ جس کو وہ ہزار خزانوں سے افضل سمجھتی ہے۔

مَیں نے کہا دفینہ تو حقیقت الامری ہے اور باقی باتیں محض دلائل ہی ہیں۔ قیاسی خطرات سے خائف ہونا فرزانگی نہیں دیوانگی ہے۔

وہ بدستور اپنے خیال پر اڑی رہی۔ اور اکثر پژمردہ اور افسردہ رہنے لگی۔ ان ہی دنوں گھر میں خُدا نے یہ لڑکی دی۔ وہ کچھ اور پریشان ہو گئی۔ مَیں نے کہا جس نے لڑکی دی ہے وہ لڑکا بھی دے گا۔ مگر وہ بدستور چُپ رہی۔

گھر میں فاقے گذر رہے تھے۔ دفینہ کی خیالی خوشی میں کب تک مگن رہتے۔ ایک دن خیال آیا کہ والد مرحوم کا ایک دوست تھا۔

اِس بدحالی اور درماندگی میں اس سے امداد طلب کریں۔ چنانچہ میں اسکے پاس گیا۔ وہ دیوانِ حافظ پڑھ رہا تھا۔ اور میرا حال پریشان دیکھ کر بہت فکرمند ہُوا۔ مَیں نے اُسے متوجہ پا کر عرضِ حال کیا۔ امداد پر آمادگی دیکھ کر ایک دفینہ کی دستیابی کی امید کا بھی اظہار کیا۔ اس نے اپنی عینک اتار کر رکھ دی اور میری طرف بغور دیکھنے لگا۔ مَیں اس کے اس طرح دیکھنے سے خود ہی شرمندہ سا ہو گیا۔ والدِ مرحوم کا دوست بولا کہ ملک کے پراگندہ خاطر اور بے ہمّت نوجوان ایسی ہی امیدوں پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے خیال میں اچانک خزانہ مل جانے کی توقع لگا لیتے ہیں۔ اور کبھی کسی امیر بیوہ کے ساتھ نکاح ہو جانے کی امید میں دل کو خوش رکھتے ہیں۔ میرے دوست کے عزیز بیٹے! تم ان سے کچھ مختلف نہیں۔ لیکن تیرے والد نے ایک دفعہ میری دستگیری کی تھی۔ مجھے ایک دفعہ تو تیری امداد ضرور کرنا چاہیئے۔ وہ گھر میں گیا۔ اور ایک ہزار کے نوٹ گن کر مجھے دیئے۔ ایک ہزار کی رقم مجھے خزانہ سے کم نہ تھی۔ مَیں نے اس کے ہاتھوں کو چُوم کر کہا کہ اس احسان کو عمر بھر یاد رکھوں گا۔

گھر میں ایک ہزار روپیہ آ گیا۔ خوشی میں خزانہ کا خیال کچھ دن بھولا رہا۔ میری آنکھوں میں دنیا کا نقشہ ہی اور ہو گیا۔ مغموم اور اداس دُنیا اب دلچسپیوں اور دلفریبیوں سے بھری ہوئی تھی۔ مَیں اکڑ کر چلتا اور تن کر

بیٹھتا تھا۔ ٹھیک مسلمانوں کی طرح ہر وقت چُولھا گرم رہتا اور مختلف کھانوں کی بُو باس سے طبیعت بشاش رہتی۔ بیوی کے لئے میری فرمائش مصیبت بنی رہتی تھی۔ ایک دن اُس نے کہا کہ یہ روپیہ تو یوں اُڑا دو گے۔ خوشیوں کے بعد بُرے دن کاٹے سے بھی نہیں کٹتے۔ اس بے عملی سے دفینہ کی تلاش ہی میں لگتے تو اچھا تھا۔

خواہ اُس نے کسی دل سے کہا، مگر میں آمادۂ تلاش ہو گیا۔ اس نقشہ پر رات دن محنت کی قطب صاحب کی لاٹ کے دو میل دور مقام معین ہُوا۔ آبادی سے دُور ہونے کے باعث وہ زمین سستے داموں مل گئی۔ آلاتِ کشاورزی لے کر بظاہر زمینداری کیلئے آمادہ ہو گیا۔ کسان کی بیوی کی طرح میری بیوی سارا دن کھیت پر ہی کام کرتی تھی۔ ہمارا کام کیا تھا زمین میں گڑھے کھودنا اور شام کو پُر کرنا۔ دو ماہ کی محنتِ شاقہ کے بعد کشتِ امید ہری ہو گئی۔ گڑھے کھودتے کھودتے ایک چاندی کی منقش صندوقچی مل گئی۔ جس کو آسانی سے اٹھا چھپا کر گھر لے آئے۔ کانپتے ہاتھوں سے اُسے جلدی سے کھولا۔ مخمل کی تہ اُٹھائی نظر افروز جواہرات کے بیش قیمت ٹکڑے رنگ برنگ کے مخملی خانوں میں چمک رہے تھے۔

بیوی کو خوشی سے مَیں نے گلے لگا لیا۔ وہ بھی دیر تک بے حس چھاتی سے لگی رہی۔ آج کلبۂ تاریک روشن معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ دل کی دنیا

مسرت سے چمک اُٹھی تھی۔

فطرت شناس بیوی نے کہا کہ پہلے لباس بنواؤ۔ پھر سب سے چھوٹے ٹکڑے کو بازار لے کر جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ حالِ پریشاں سے سرقہ کا شبہ گذرے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ میری صُورت کو درزی کی دستکاری نے سچ مچ کا شہزادہ بنا دیا۔ ہر جوہری نے مجھے عزّت سے بٹھایا۔ اور شہزادوں کی روایتی سادہ لوحی سے فائدہ اُٹھانا چاہا مگر مَیں ایک ایک جوہری کے پاس گیا اور قیمت کا صحیح اندازہ کر کے شام کو وہ ٹکڑا دس ہزار میں فروخت کر کے گھر آیا۔ اگر اس قیمت سے سارے ٹکڑوں کا اندازہ کیا جائے تو کئی ارب کی جائداد منقش صندوقچی میں بند تھی۔ مجھے معلوم نہیں مَیں شادیٔ مرگ کیوں نہ ہو گیا۔ مگر خوشی سے مستِ شراب کی طرح لڑکھڑاتا چلتا تھا۔ خوش آئند زندگی کا تصوّر مجھے اکثر ماحول سے بے خبر رکھتا تھا۔

آہستہ آہستہ طبیعت نے سکون اختیار کیا اور مَیں گھر کے حالات بتدریج بہتر بنانے میں مصروف ہو گیا۔ عمدہ مکان کرایہ پر لیا اور آہستہ آہستہ لباس اور سامان کو بہتر بنایا اور فارغ البال زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ تاکہ تدریجی ترقی شک و شبہ سے بالا بنا دے اسی وجہ سے مَیں اپنے والد مرحوم کے دوست اور اپنے محسن سے کتنی

کتراتا رہا۔ مبادا میرے حالات کا علم ہو کر عوام میں سرگوشیاں شروع نہ ہو جائیں۔

جب عمدہ سوسائٹی کے طور طریقوں سے ذرا مانوس ہو گیا۔ تو جواہرات کا ایک اور ٹکڑا لے کر میں بمبئی چلا گیا۔ بڑی ٹھاٹھ سے ایک مشہور ہوٹل میں رہنے لگا۔ جوہریوں کو وہیں طلب کیا۔ دو روز کی سردردی کے بعد اڑھائی لاکھ پر سودا چکا۔ مجھے احساس ہوا کہ پہلا ٹکڑا ارزاں فروخت ہؤا۔ اب میں بیوی اور بچی سمیت بمبئی آ گیا۔ روپیہ کی میری نظر میں قیمت کیا تھی۔ نہ ختم ہونے والی دولت کا میں واحد مالک تھا۔ دن عید اور رات شبرات ہو کر بسر ہونے لگی۔ میری اہلیہ نے جواب لیڈی سلطان تھی مجھے کہا۔ صندوقچی کو چور لگ جانے کا خطرہ ہے۔ مناسب ہے کہ یورپ کی منڈیوں میں جواہرات فروخت کر کے جائیداد خرید لی جائے۔ تاکہ میری طبیعت سے نگرانی کا بوجھ کم ہو۔ ہم پاسپورٹ لیکر فرانس پہنچے۔ تھوڑے جواہرات فروخت کر کے بے انداز دولت حاصل کی۔ تمام بڑے بڑے بنکوں میں حساب جاری ہو گیا۔ اگرچہ دولت کی بھوک نہ رہی تھی۔ پھر بھی دوسرے ممالک میں جواہرات کی فروخت کو چل نکلے۔ صورتِ حال یہ ہو گئی کہ ہر بڑے ملک کے چھوٹے بینک میں بھی روپیہ موجود تھا اور میں ایک برس میں بین الاقوامی شہرت کا سرمایہ دار بن گیا۔

اس کے بعد میں نے ملک ملک دیکھا۔ شہر شہر گھوما۔ کوئیں کوئیں کا پانی پیا۔ اوج و ثروت نے پستیوں کا خیال بھلا دیا۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ دنیا کے رنج و غم کیا ہوتے ہیں۔ ایک دن میں امریکہ سے اٹلی جا رہا تھا ساحل قریب رہ گیا تھا۔ بیوی اور بچی عرشۂ جہاز پر کھڑی ساحل کے نظارہ کے لطف حاصل کر رہی تھیں۔ یکایک بیوی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ایک متلی ہوئی۔ میں اسے نیچے کمرے میں لے آیا۔ آناً فاناً حالت غیر ہو گئی۔ ڈاکٹر ابھی پہنچنے نہ پایا تھا کہ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میری زندگی کی بہار خزاں سے بدل گئی۔ روشن دنیا میرے لئے اندھیر ہو گئی۔ دل میں ایک غبار سا اُٹھتا تھا۔ آنسوؤں کو رُومال سے پونچھتا تھا۔ مبادا بچّی کی طبیعت اس ناگہانی غم سے مستقل اثر قبول کر لے۔

غم کے اس بوجھ نے میری حیات کے زاویہ نگاہ کو بدل دیا۔ لااُبالی زندگی بسر کرنے کی بجائے میں مقصدِ زندگی کی ٹوہ میں لگ گیا۔ بیوی دنیا میں آئی چلی گئی۔ میں آیا چلا جاؤں گا۔ مگر اس آنے جانے کا مقصد کیا ہے۔ اس خیال نے مجھے جوانی کے پُر بہار گلزار سے نکال کر فکر و تدبر کے ریگستان میں لا پھینکا۔ میری حرکات اب بھی محفوظ ہو گئیں۔ اور طبیعت میں متانت بڑھ گئی۔ تعجب نہ تھا کہ میں غم اور فکر میں صحت کی دولت کھو بیٹھتا۔ اس لئے میں نے

سوچا کہ غم کے خیال کو دُور کرنے کے لئے کوئی اور مشغلہ تلاش کرنا چاہیئے۔ تاکہ دوسرے شغل سے فرصت نہ ملے۔ اور غم غلط رہے بیوی کے حسن واخلاق کے باعث میں امرا کے رنگین مشاغل سے مجتنب رہا تھا۔ اب بھی اس کی ایمانداریوں کی یاد غلط روی سے مانع تھی۔ جب وہ اٹھ گئی جس کی وجہ سے دنیا حسین تھی۔ تو حسن ومحبت کی داستانوں سے بھی دل اُچاٹ ہوگیا۔ اس لئے غمزدہ اور حرماں نصیب لوگوں کی دلجوئی میرا محبوب مشغلہ ہوگیا۔ لندن میں اقامت اختیار کرکے لارڈ بشپ کی معرفت غریب لوگوں کی امداد میں بے دریغ روپیہ بہایا۔ مگر مجھے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ میری غیر منظم ہمدردی انسانیت کی سطح کو بلند کرنے میں ممدومعاون نہ ہوسکیگی۔ غریب پر یہ رحم نہیں کہ اُسے امراخیرات دیں۔ بلکہ نظامِ حکومت میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ غریب لوگ شخصی خود داری کو چھوڑ سے بغیر حکومت سے امداد حاصل کرنا ملکی حق سمجھیں۔ حکومت کا واحد مقصد یہ ہو کہ ملک کے مالیات کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرکے ابنائے وطن کو افلاس کی ذلت سے بچایا جائے۔ ملک کی دولت کو ایک جگہ پڑا رہنے اور ایک جگہ جمع ہونے سے اس اسلوب سے روکا جائے کہ ایک طرف غنی اور دوسری طرف گدا پیدا نہ ہوں۔ اور سرمایہ دار مزدور کو لوٹنا

پیدائشی حق نہ سمجھے۔ ملک کا ہر فرد بشر خوشحال ہو اور وہ فطرت کے لازوال حسن اور قدرت کے لاتعداد مناظر سے لطف اندوز ہو کر دن خوشی میں اور رات امن سے بسر کرے۔

ان قیاسات کی بنا پر یورپ کی بجائے ایشیا میری توجہات کا محتاج تھا۔ جہاں انسانیت بے بسی میں پڑی کراہ رہی ہے۔ جہاں کے لوگ یورپ کی ریشہ دوانیوں سے بے خبر ان کی تاروں پر پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں۔ اور وہ چھوٹی چھوٹی ذاتی اغراض کے حصول کے لئے ملک و ملت کے بلند مقاصد کو قربان کرنے کیلئے آمادہ رہتے ہیں۔

خیالات کی اس تبدیلی نے مجھے نقلِ مکانی پر مجبور کیا اور مَیں نے بغداد کو اپنا مسکن و مدفن بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ بارہ برس سے مَیں اسی جگہ مقیم ہوں اور آرزو یہ ہے کہ میری ابدی آرامگاہ بھی یہیں ہو۔

عزیز محسن۔ بیوی کی موت کے بعد میرا اسمندِ فکر ہمیشہ ہندوستان کی اُجڑی دلہن (یعنی دہلی) کی طرف جاتا رہا۔ مجھے عسرت کے وہ دن یاد آتے ہیں۔ جب فاقہ کی بدحالیوں سے دنیا تاریک تھی۔ مَیں نے اپنے والدِ مرحوم کے اس دوست کو مالا مال کر دیا تھا جو آڑے وقت میں میرے کام آیا۔ ساتھ ہی میں صاحب دفینہ کی

اس خواہش کو نہیں بھولا جس کی وجہ سے مَیں دُنیا کا ممتاز ترین فرد ہُوں۔ اگرچہ مَیں اپنی ثروت کے مقابلہ میں ایک گمنام زندگی بسر کر رہا ہُوں، تاہم لڑکی کے ناطہ کی خواہش کے باعث یہ گھر ممتاز امرا کی آرزوؤں کا مرکز ہے۔ لیکن مَیں نے اس تحریر کے مطابق فیصلہ یہ کر رکھا ہے کہ میری دولت اور میری لڑکی کی محبت کا حقدار وہ ہوگا جو صاحبِ دفینہ کے سوالات کا صحیح حل پیش کرے گا۔ اس نوشتہ کے مطابق میری عمر کا یہ آخری سال ہے۔ مَیں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ چھ ماہ کے اندر اندر ہندوستان کی پرانی رسم کے مطابق جگ رچاؤں اور شادی کے خواہشمند نَوجوانوں کے سامنے وہ شرط پیش کر دوں جو اس کاغذ پر مرقوم ہے۔

محسن نے شہزادہ سلطان المعظم کی اس کہانی کو ہمہ تن گوش ہو کر سُنا۔ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر رہا۔ بات ختم ہوگئی۔ محسن نے کمر کرسی سے لگالی۔ اثر پذیر ہو کر خیال میں ساری کہانی پر نظر ثانی شروع کر دی۔ وہ اپنے خیال میں محو تھا کہ برتن اُٹھانے کی آواز سے چونکا اور کہا کہ دفینہ کی نسبت صاحب دفینہ کے سوالات کا جواب زیادہ قیمتی ہے۔ دیکھئے کون اِن انقلاب آفرین سوالات کا صحیح جواب لانے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔

کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد پھر آنے کا وعدہ کر کے وہ رخصت ہو کر باہر آیا۔ اور عالمِ خیال میں سوالات کے جوابات کی تلاش میں سرگرداں گردن جھکائے جا رہا تھا کہ ستار کے بجنے کی اچانک آواز نے پھر اسے تصورات سے چونکا دیا۔ شہزادی خوبصورت ستار لیئے مرمریں تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ نگاہ تالاب کی رنگا رنگ مچھلیوں پر مگر انگلیاں تاروں سے ٹکرا کر جُدا ہو رہی تھیں۔ اس نے محبت کا درد بھرا راگ اس سوز سے گایا کہ دل کے دریا میں آگ سی لگ گئی۔ وہ گاتی گاتی راگ کے ساتھ خود جھُوم جاتی تھی۔ نغمے تالاب کی دھیری موجوں میں بے خود ہو کر بہہ رہے تھے۔ کچھ نہ راگ کی روانی میں خود یُوں بہی جاتی تھی جیسے کوئی محوِ خواب حسین خُوبصورت بجرے میں لیٹی پانی کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہی جا رہی ہو۔ ہوا میں عارضی سکُون تھا۔ باغ کے خوش گلو پرندے خاموش تھے۔ اس کے لبِ لعلیں الفاظ کی ادائیگی کے لئے ملتے اور جُدا ہوتے۔ شفقِ تزریں میں نور کی بجلیاں برسا رہے تھے۔ نغمہ کی محویّت میں دوپٹہ سر سے ڈھلک گیا تھا۔ زلفوں نے چہرے پر بکھر کر حُسنِ بے پروا کو اور حسین بنا دیا۔ اس کی آنکھوں میں پریم کی گنگا بہتی تھی۔ اور وہ نُور کی بارش برسا رہی تھی۔ خدا جانے راگ ختم ہو گیا یا اثر میں

خود کھو گئی۔ ساز ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ آنکھیں بند کئے سانس روک کر
یوں بیٹھ گئی۔ گویا کوئی آسمانی دیوی کیلاش کے روحانی ماحول میں
پروردگارِ حُسن سے لَو لگائے غیر فانی محبت کے سرمدی نغمے گوشِ دل
سے سننے میں محو ہے۔ وہ آہستہ آہستہ خوابِ محویّت سے بیدار ہوئی۔
اور اُس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں حسین صبح رات کے
آغوش سے بیدار ہوگئی۔ اُس کے لبوں پر روحانی مسکراہٹ اور چہرہ پر
معصُومیت کروٹیں لے رہی تھی۔

محسن ٹھٹک کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ حسین حسن کے اثر کو جانے
بھی تو کیا جانے۔ مغنّی نغمے کی خُوبی کو سمجھے بھی تو کیا سمجھے حسن اور راگ
کی ایسی دل آویز یک جائی نے جو اثر محسن پر کیا وہ ضبطِ تحریر میں کیا
آئے۔ محسن کی متاعِ متانت جل کر خاک ہوگئی۔ وہ اُف اُف کر اُٹھا۔ اس
کی آہ سے وہ سنبھل بیٹھی۔ اس کے سنبھلنے سے محسن بھی سنبھل سنبھل کر چلا
اور ہوٹل میں بستر پر گر کر اوندھے لیٹ گیا۔ قدرت کے تصویر خانہ میں
ہزاروں دلکش مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن حسنِ یار کا ایسا پر اثر نظارہ
کسی نے نہ کیا تھا۔ محبت کے لاکھوں راگ گائے گئے۔ مگر ایسی درد بھری
راگنی کسی نے کب سُنی ہوگی۔ محسن دیر تک ان ہی کیفیتوں میں کھویا
پڑا رہا۔ اس کا دماغ کئی دن تک جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش بنا

رہا۔ اُس نے دل میں کہا سلطان المعظم کے پاس دولت سہی مگر شہزادی نیلوفر وہ پاکیزہ موتی ہے کہ کون و مکان کے خزانے اس کے تاوان کو کافی نہیں۔

محسن نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اگلے دن نہ پہنچا دوسرے دن نہ گیا۔ یُوں ہفتہ گذر گیا وہ مسرور تھا کہ محبُوب کے اس منظرِ خوش نے عارضی طور پر اسے خُود اس سے مستغنی کر دیا ہے۔ محسن کا آنا بھی مشرق کے روایتی معشوق کا وعدہ ہو گیا۔ اس لئے باز دید کے طور پر سلطان المعظم خود ہوٹل میں چلا آیا۔ محسن گو کسی سے ہیٹا نہ تھا۔ مگر شہزادی نیلوفر کے باپ کا چل کر آنے کو عزت کا باعث سمجھا اور دلی ندامت سے معذرت کرنے لگا۔

سلطان المعظم تھوڑی دیر بیٹھا اور مزاج پرسی کر کے چلا آیا۔ اتنے میں ہوٹل کا مینجر ہانپتا اور خوش خوش آیا کہ آپ کی وجہ سے مَیں نے بڑی عزت پائی۔ کہ اتنی بڑی شخصیت نے یہاں قدم رنجہ فرمایا۔ ان کے مشاغل مطالعہ کے کمرے اور شکارگاہ تک محدود ہیں۔ البتہ یتیموں کی پرورش ان کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس کے یتیم خانہ میں بچّے ناز سے پالے جاتے ہیں۔ کوئی امیر باپ اپنے اکلوتے بیٹے کے ایسے چاؤ نہیں کر سکتا۔ آپ کی وجہ سے سلطان المعظم نے آ کر اس جگہ کو برکت دی۔

شہزادی نیلوفر ایسی حیاپرور لڑکی خُدا نے اسے دی ہے۔ جس کی رُوح عالمِ خیال میں بھی دنیاوی خطاؤں سے داغدار نہیں ہوئی۔

مینیجر چلا گیا۔ محسن نے سلطانِ المعظم کی خواہش پر غور کر کے اگلے روز ملاقات کے لئے جانے کا تہیّہ کر لیا۔ جلوہ طور کے تکرار کی تاب اب بھی نہ تھی۔ تاب ہو یا نہ ہو شوقِ دید ضرور تھا۔ وہ ذوقِ محبت سے منزلِ محبوب میں داخل ہؤا۔ دیکھا کہ شہزادی اُداس سی کھڑی فضا کو تک رہی ہے۔ اداس حسن بھی بشاش پھول سے کم نہیں ہوتا۔ محسن کی آنکھوں میں تروتازگی آگئی۔ مگر کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ بارے خدا، ملال کی کوئی معقول وجہ نہ ہو محسن کی آہٹ پا کر اُس نے دیکھا۔ دیکھتے ہی حسن پر بہار آگئی۔ چہرہ شگفتہ گلزار بن گیا۔ اور اس حجاب مآب نے بڑھ کر شرمیلی نسوانی آواز میں کہا۔ اتنے دن نہ آئے مُحسن!

محسن کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا لیکن عذرخواہی کی شہزادی اس کے عذر لنگ کو بھی معقول سمجھ کر خوش ہوگئی۔ عورت مرد کی جھُوٹی آہ کو سچّا عشق سمجھتی ہے۔ سچّی محبت میں جھوٹے عذر کو قابل پذیرائی سمجھنا تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اس کے فرحت بخش عذر سے دل شاد ہو کر وہ خوشی سے صوفہ پر بیٹھ گئی۔ وہ گلے اور شکایتیں

وہ شبہات اور شکوک جو اس کے وہم کی پیداوار تھی جاتے رہے۔
محسن خوشی سے اٹھلاتا سلطان المعظم کے مخصوص کمرے کی طرف بڑھا۔ ملازم کمرے کے پردوں کو ادب سے کھول کر کھڑا ہو گیا۔ سلطان المعظم نے محسن کو دیکھ کر "خوش آمدید" کہا۔ محبت سے پاس کی کرسی پر بٹھایا۔ ابتدائی گفتگو کا سررشتہ متین مضامین سے جا ملا۔ مشرق و مغرب کی تہذیب کا موازنہ ہونے لگا۔ محسن نے کہا کہ میں درسگاہِ عالم میں طفلِ ابجد خواں ہوں۔ میرا علم مطالعہ کتب پر مبنی ہے۔ آپ کا تجربہ بہترین محاکمہ ہو سکتا ہے۔

تہذیبِ مغرب و مشرق

سلطان المعظم نے کہا۔ عزیز محسن! میرے نزدیک تہذیبِ مغرب وہ گیسو بریدہ نازنین ہے جس کی عُریانی سے حیا بھاگتی ہے۔ وہ روحانی پاکیزگی کی نسبت افزائشِ حسن پر اعتماد رکھتی ہے۔ ہر وقت نظر افروز غازوں کی مرہونِ منت رہتی ہے۔ تاکہ دلفریبیوں کے سامان جمع رہیں اور راہ گذر پر اس کی خاموش چوٹ ضرب کاری کا کام دے۔ وہ بتِ طناز گلی و بازار میں تن کر چلتی ہے۔ تیرِ نظر برساتی اور سِنس ہنس کے بجلیاں گراتی چلی جاتی ہے۔ دل لینے کے لئے معصوم بنتی ہے۔ متاعِ عیش لوٹ کر بات نہیں کرتی اسے عزت لٹنے اور عصمت برباد ہونے کا غم نہیں۔ دامِ تزویر میں

پھل لینے کے لئے وہ تمام دلفریب اداؤں کو ختم کر دیتی ہے۔ اور کام نکالنے کے لئے نامحرم کے آغوشِ الفت میں چلے جانے یا اُسے اپنے پہلو کی زینت بنا لینے میں مضائقہ نہیں۔ وہ شوخ و شنگ لگاوٹ سے رُخ کو ٹوپی کی اوٹ میں چھپا لیتی ہے۔ اور بناوٹ سے روٹھ جاتی ہے۔ پھر خود ہی چاہنے والوں کے پہلوؤں میں چٹکیاں لیتی ہے۔ اور گدگداتی ہے۔ کبھی الفت کے اظہار میں رو دیتی ہے۔ اس کے ٹسوے ہمدردی کے آنسو نہیں۔ بلکہ مطلب اقوامِ عالم کو فریبِ محبت میں مبتلا کر کے ان کے سامانِ زیست کو غائب غلّہ کرنا ہے۔ لیکن زمانہ اس کی ابرو باختگی کے باوجود دیوانہ ہے

تہذیبِ مشرق۔ وہ چھوئی موئی حسینہ ہے جو نامحرم کے سایہ سے ناپاک اور سورج کی کرن سے میلی ہو جائے۔ گھونگٹ سے بدن کو اپنی نظروں سے چھپائے رام نام لیتی گنگا جل بھرنے جا رہی ہے۔ آنکھوں میں حیا ماتھے پر نور کا قشقہ، زبان میں شیرینی، دل میں چھوٹے بڑے کی عزت ارادہ میں گھر بھر کی خدمت ہے حسین مگر سادگی، سنگار اور معصوم ادائیں اس کا ہتھیار ہیں۔ وہ منہ اُٹھائے راہ نہیں چلتی۔ بلکہ زمین پر نظریں جمائے قدم قدم پر رکتی ہے۔ اس کی آہستہ خرامی لگاوٹ یا بناوٹ نہیں۔ بلکہ کیڑے مکوڑوں کو پائمالی سے بچاتی

ہے۔ جاں ستانی کی بجائے غم کی چتا میں جلنا جانتی ہے۔ وہ اپنے گھر کی چاردیواری میں خوش اور پتی برتا میں مگن ہے۔ وہ دوسروں کے ہاں ڈاکہ ڈالنے کی بجائے دولت دنیا کو دان کرتی ہے۔ وہ آنگن اندر دونوں کو صاف رکھتی ہے۔ حسن کی زینت پر روح کی پاکیزگی کو قربان نہیں کرتی۔

لیکن زمانہ اس پاسِ حیا کے باوجود اسے عزیز نہیں رکھتا"

مُحسن نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔ ایسا کیوں ہے محترم؟

سُلطان المعظم نے افسردہ سا ہو کر جواب دیا۔ مَیں کیا کہوں عزیز

(کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے)

مُحسن نے مُہرِ سکوت توڑ کر کہا کہ میری خواہش ہے کہ یورپ کا ایک نظر جائزہ لے کر جلدی لَوٹ آؤں۔

سلطان المعظم نے کہا کہ مجھے تیرے ساتھ کُچھ دلچسپی سی ہو گئی تھی لیکن مجھے تیری خوشیوں میں حائل ہونے کا حق نہیں جب جاؤ تو میری دعائیں تمہارے ساتھ ہونگی۔ اور دوستوں کو تعارفی خطوط لکھ کر تمہاری امداد کر سکوں گا۔

محسن شکریہ ادا کر کے اُٹھا۔ سلطان المعظم بھی ہولے ہولے اس کے ساتھ ہولیا۔ اور دروازہ تک آیا محسن نے پاسِ ادب سے

اِدھر اُدھر نہ دیکھا۔ الوداع کہہ کر چلا آیا۔ واپسی پر پھر ایک دفعہ دیکھنے کی حسرت دل میں لیکر ہوٹل میں پہنچا۔ دو دن چھوڑ کر پھر گیا مگر محروم دید لوٹا۔ دوسرے دن گیا یاس لے کر آیا۔ پھر گیا پھر بھی وہ نظر نہ آئی۔ طبیعت میں اضطراب بڑھ گیا۔ کس سے پُوچھے کہ وہ تسکینِ دل کہاں گئی۔ خود سُلطان سے پُوچھے یہ جرأت نہیں۔ خدام سے دریافت کرے اس میں عزت نہیں۔ صبر کر کے بیٹھ نہیں سکتا۔ بیٹھے تو صبر نہیں آتا۔ آخر یہ بات کیا ہوئی اور ہو تو کیا ہو۔ ایک دفعہ جرأت کر کے چلا کہ سلطان المعظم سے صاف پُوچھ لُوں گا۔ مگر وہاں جا کر شہزادی کی صحت دریافت کی۔ انہوں نے کہا خدا کا شکر ہے بخیریت ہیں۔

وہاں سے خیریت کی خبر سُن کر محسن صاحب فراش ہوا۔ خیریت بھی ہے اور مُلاقات بھی میسّر نہیں۔ عاشق کو مخمصہ کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ جان پر اضطراب کا عذاب طاری تھا کہ ہرکارہ خط لایا۔ کھولا تو سر نامہ نہ تھا نہ نویسندہ کا نام تھا۔ صرف یہ عبارت تھی:۔

"کیا آپ یورپ جا رہے ہیں۔ آج شام پُل پر

ملاقات کریں"

عقدہ لانیحل آسانی سے وا ہو گیا۔ محسن کا اضطراب جاتا رہا۔ خیال کیا کہ میں نے جو سفر یورپ کا ذکر سلطان المعظم سے کیا۔ اس کی

بھنک شہزادی کے کان تک پہنچی - اتنے دن افسردہ و آزردہ سامنے نہیں آئی محسن اپنے اضطراب پر اس کی حالت کا قیاس کر کے پریشان ہوا - اور سر شام پل پر چلا گیا - شہزادی پہلے سے آکر گھوڑا کھڑا کر کے چابک سے پانی کے ساتھ بظاہر کھیل رہی تھی مگر خیال کسی جگہ اور تھا - مُحسن پہنچا تو شہزادی نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا مبادا کوئی دیکھنے سننے والا نہ ہو - تنہائی کا یقین کر کے شہزادی محبت بھری آواز میں بولی محسن کیا آپ یورپ جانے والے ہیں -

مُحسن - ارادہ تھا -

شہزادی - اور اب -

مُحسن - اب نہیں -

شہزادی - کیوں -

مُحسن - اس لئے کہ میری دلچسپیوں کا مرکز اب دجلہ کا پُل بن چکا ہے -

شہزادی - اور کب تک رہے گا -

مُحسن - جب تک کسی کی شرائط شادی کا اعلان نہیں ہو جاتا -

شہزادی نے پابرکاب ہو کر اک دل نواز تبسم سے محسن کو دیکھا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا - شہزادی حدیث عشق سُن کر خوش تھی مُحسن اظہار محبت سے خورم تھا - دونوں آج کی ملاقات سے خوش و خورم

آ بیٹھے۔ اس کے بعد گو تنہائی اور یک جائی میسر نہ آئی۔ مگر راہ چلتے آتے جاتے ملاقاتیں اور محبت کی گھاتیں جاری رہیں۔ سلطان معظم نے شرائطِ شادی کے اعلان کے لئے آئندہ موسم بہار کی تاریخ مقرر کردی تھی۔ شہزادی کی صورت اور سیرت کا شہرہ دُور دُور پہنچ چکا تھا۔ ملک ملک کے عاشق مزاج امرا اور آوارہ طبیعت غربا بھی تقریب میں شمولیت کے لئے آئے۔ شہر کے باہر خیموں کا شہر آباد ہوگیا۔ چرچا تھا کہ محبوب سولہ سنگار کر کے جلوہ افروز ہوگا۔ صبح تقریب تک خوشی سے کون سویا۔ جو سویا اُسے بھی خوشگوار خواب اور خواب میں خوشگوار مناظر دکھائی دیتے رہے۔ شوقین لوگ رات بھر آراستہ ہوئے۔ تاکہ شہزادی کی اک نظرِ خوش کے حقدار ٹھہر کر مدّت تک اس کے حسین تصوّر کو سامانِ فرحت بنائے رکھیں۔

دجلہ کے کنارے ایک شاہی شامیانہ ایستادہ کردیا گیا تھا مرکز میں ایک خوبصورت چبوترا بنا ہوا تھا۔ چبوترہ کے گرد کرسیاں بچھی تھیں۔ جن پر صبح ہی نوجوان قبضہ جما کر بیٹھ گئے تھے۔ ۸ بجے تک شامیانہ کھچا کھچ بھر گیا۔ طبیعتیں زحمتِ انتظار سے بے چین ہونے لگیں۔ نگاہیں بار بار داخلہ کے دروازوں کی طرف اُٹھنے لگیں۔ ناگاہ قرنا پھونکی گئی۔ یہ شہزادی کی آمد کا اعلان تھا۔ ہر نوجوان اپنی جگہ

پر بن کر بیٹھ گیا اور مونچھوں کو اضطراب سے بل دینے لگا۔ شہزادی نیلوفر گلاب کے پھولوں سے سجی بگھی میں دلہنوں کا سا سنگار کئے سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بگھی عقب کے دروازہ پر ٹھہری۔ شہزادی سہیلیوں کے جھرمٹ میں اتری۔ دیکھنے والوں نے کہا کہ چاند دن کے وقت ستاروں میں گھرا کھڑا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھی۔ چبوترے پر چڑھی اور زرنگار کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں نیچی تھیں۔ سب کی نگاہیں اس پر تھیں۔ آسمانِ خوبی سے نور کی بارش ہو رہی تھی۔ سحرِ حسن سے مجمع مبہوت تھا۔ سلطان معظم نے اُٹھ کر شرائط شادی کا اعلان کیا۔ نوجوانوں کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اکثر سر کھجلانے لگے۔ کچھ ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگے مجمع میں لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہوئے اُٹھے کہ لو بھئی ہو چکا مذاق۔ کسی نے کہا کہ غیر فانی مخلوق کی تلاش دیوانگی ہے۔ سلطان المعظم کا دماغ چل گیا ہے۔ تاہم مجمع میں چند سر پھرے نوجوان ایسے بھی اُٹھے جنہوں نے حسن کی سرکار میں زندگی کی نذر گزارنے کا فیصلہ کیا اور بڑھ کر نہایت ادب سے شہزادی کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

شہزادی نے گھبرا کر ہجوم پر نگاہ کی، محسن ایسا بزدل نہیں ہو سکتا۔ اُس نے دل میں کہا محسن خاطر جمع سے مجمع میں بیٹھا تھا۔

شہزادی کی پریشانی کا سبب سمجھتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھا۔ قریب جا کر ادب سے سر جھکایا۔ شہزادی کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور اُلٹے پاؤں پیچھے آ گیا۔ ایک گھڑی کے بعد شہزادی اُٹھی۔ اس نے نگاہِ ناز سے سب کو دیکھا۔ دائیں بائیں گردن جھکا کر سب کو سلام کیا۔ سہیلیاں بھی اُٹھیں اور اُسے گھیرے میں لے لیا۔ وہ آہستہ آہستہ یوں روانہ ہُوئی جوں ہلکے ہلکے بادلوں میں چاند اور تارے ہولے ہولے چلتے نظر آتے ہیں۔ وہ پھُولوں سے مزیّن بگھی میں بیٹھ گئی۔ گھوڑے تن تن کر قدم اٹھانے لگے۔ لوگوں کو معلوم ہُوا کہ آسمان کی غیر فانی مخلوق رُو نمائی کے لئے آئی تھی اب پھر نور کی دنیا میں واپس جا رہی ہے۔

مجمع منتشر ہو گیا آہستہ آہستہ سحرِ حسن اُترنے لگا۔ جنہوں نے عارضی اثر کے ماتحت ہاتھ چُوما تھا ہوش میں آنے لگے۔ ایک عورت کے عشق میں ہری پربت کے پتھروں سے اس امید پہ کون سر ٹکراتا پھرے کہ محبوب کا وصل میسّر آ جائے۔

محسن رختِ سفر درست کر کے سلطانِ معظّم کے پاس رخصت کے لئے گیا مگر دروازہ پر پہرہ تھا۔ دریافت پر بات کھلی کہ شہزادی نے اب منظرِ عام پر آنا چھوڑ کر پردہ اختیار کر لیا ہے اور سلطانِ معظّم چند دن کے لئے شکار گاہ کو گئے ہیں۔

آئینِ عشق اب ایک منٹ ضائع کرنے کا متحمل نہ تھا۔ اس لئے محسن نے اپنے خاندانی ملازموں کو رخصت کیا۔ آپ اللہ کا نام لیکر چل کھڑا ہؤا۔ عالمِ خیال میں شہزادی خوبصورت ناؤ کو دجلہ کے پانیوں میں کھیتی اور حُبِّ وطن کے گیت گاتی نظر آئی۔ پھر متوجہ ہو کر محبت سے بولی جاؤ اور کامیاب لوٹ کر آؤ محسن میں بھی پل پر کھڑی ترا انتظار کرونگی جہاں قسمت نے پہلے دن ملایا تھا۔

ہندوستان

سلطان معظم کو پرچہ نویسوں نے اطلاع دی کہ اور نوجوانوں نے ہمت ہار دی ہے مگر ایک محسن ممبئی روانہ ہو چکا ہے۔ سلطان معظم نے افسوس کیا کہ ایشیا کے نوجوان ہمت کے ایسے ہیٹے ہو گئے ہیں۔ شہزادی نے یہ خبر سنکر اطمینان کا سانس لیا۔ باپ کو کہا ابا ایک ہی شخص پابندِ قول رہ گیا ہے۔ اب صرف وہی تمہاری آرزوؤں کا مرکز ہے۔ منزل ایسی کٹھن ہے کہ جس کا تصوّر ہی روح فرسا ہے۔ کتابوں میں پڑھا ہے کہ زندگی کے دشوار گذار رستے عورت کی مدد کے بغیر طے نہیں ہو سکتے۔ دلی خواہش ہے کہ مَیں مرد بنوں اور تبدیلِ لباس کر کے مُحسن کے عزم میں اعانت کروں۔ اگرچہ مذہبی روایات ناجنس کی ہمراہی میں سفرِ حج کی بھی متحمل نہیں۔ مگر غیر معمولی حالات میں غیر معمولی قدم اُٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے محسن کے ناکام لوٹنے سے بہتر ہے کہ مَیں جا کر مہم سر کرنے میں مدد دوں۔

سلطانِ معظم نے بیٹی کی طرف محبّت سے دیکھ کر کہا۔ آئین

اخلاق مانع نہ ہوتا تو مَیں تمہارے عزّتِ نفس پر اعتبار کر کے اجازت دے دیتا مگر شفقتِ پدری موت سے پہلے تمہیں آنکھوں سے دُور رکھنے کی متحمل نہیں۔

شہزادی نیلوفر۔ پیارے ابّا، اگر فرض مجھے مجبور نہ کرتا تو مَیں تمہارے قدموں میں جان دینے میں خوشی محسوس کرتی۔ قیاس کرو محسن بھی کسی ماں باپ کا بیٹا ہے۔ وہ کہاں کہاں کی خاک چھاننے گیا ہے۔

سلطانِ معظم سے کوئی جواب بن نہ آیا بیٹی کے اشاروں نے ہزار تقریر کا اثر پیدا کر دیا۔ اور وہ خاموش ہو گیا۔ بیٹی نے باپ کی گردن میں ہاتھ حائل کر کے کہا مجھے اِس نوشتہ کے مطابق معلوم ہے کہ ہم زندگی میں نہ مل سکیں گے۔ مگر اِن سوالات کا صحیح حل نصف نسل انسانی کو لعنتِ غلامی سے نجات دے گی۔ بابا! بہشت میں تیری رُوح مسرور ہو گی کہ بیٹی اس بڑی مہم میں شریک رہی ہے۔

سلطان معظم رومال سے آنسو پونچھتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ شہزادی باپ کی خاموشی کو نیم رضا سمجھ کر زندگی کے کٹھن سفر کے لئے تیار ہو گئی۔ دوسرے دن الوداع کہنے کے لئے باپ کے کمرے میں آئی۔ بیٹی کو سفر کے لئے تیار پا کر کلیجہ منہ کو آ گیا۔ باوجود ضبط کے اس کا دل بھر آیا۔ کیونکہ حاصلِ حیات

آج ہمیشہ کے لئے جُدا ہو رہی تھی۔

وہ فرطِ غم سے لڑکھڑا اُٹھا۔ دروازہ تک آیا۔ باپ بیٹی آخری بار گلے ملے۔ ہل ہل کر روئے۔ درودیوار پر اداسی تھی۔ خدم وحشم دُور کھڑے اس رقّت انگیز نظارے کو دیکھ کر مصروفِ گریہ تھے۔ وہ روتی رُلاتی روانہ ہو گئی۔ سلطانِ معظّم گرانباری غم سے نڈھال لیٹ کر دیر تک آنسو بہاتا رہا۔

فرض خشکی کے لحاظ سے صحرائے اعظم ہے۔ جہاں تمازتِ آفتاب سے ذرّے چنگاریاں بن جاتے ہیں۔ اور آسمان آگ اگلتا ہے۔ لووں کے آتشیں بھنور بن کر چلتے ہیں۔ جہاں جان خشک ہوتی ہو وہاں پانی کے کتنے مشکیزے کوئی اٹھا کر چلے نہ شاہراہ نہ وہاں پگڈنڈی۔ کوئی جائے تو کدھر جائے۔ پانی کا قلزم ہو تو کوئی جان خدا کے سپرد کرے اور کشتی موجوں کے حوالے کر کے لیٹ رہے۔ کہ شاید تھپیڑے کھاتی کبھی کنارے جا لگے گی۔ یہاں کوئی خود کتنا چلے اور کس سواری پر جائے۔ کبھی جا کر زہریلی ہواؤں کی لپیٹ میں آجائے گا۔ کسی جگہ جھکڑ چلنے سے ریت کے تودوں میں دب جائے گا یا پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا۔ اس لئے مسافر کو چاہئے کہ اس دشوار گذار مقام کو محبت کی راہ سے

عبور کرے۔ تم جو فرض ادا کرنے نکلے ہو۔ مسافر کے راستے کی دشواریوں کا اندازہ کرو۔ اس خشک سفر کو محبت کی راہ سے پورا کرو۔ محبت ہی اس وادیٔ رنگین کا نام ہے۔ جہاں جگہ جگہ فردوسِ گوش اور جنتِ نگاہ نظارے دامنِ دل تھام لیتے ہیں۔ جہاں بڑی بڑی نہریں چھوٹی چھوٹی خوبصورت جھیلوں سے نکل کر محبوب کی زلفوں کی طرح ساری وادی میں پیچ کھاتی چلی جاتی ہیں۔ جہاں زمین پر سبزے کا فرش بچھا ہے اور قدرت اس پر شبنم کے موتی بکھیر کر طبیعت کو نہال کر رہی ہے۔ جہاں آبشاریں فراق کی کہانی عاشق کی طرح رو کر سناتی ہیں اور پاس ہی نازک ڈالی پر بیٹھی ہوئی بلبل پھول کے کان میں رازِ محبت کہہ رہی ہے۔ وہاں صبح اس طرح نمودار ہوتی ہے گویا کوئی نازنین نہا دھو کر بالوں کو چہرے سے ہٹا دے اور آئنہ کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے ہی حسن کو اطمینان کی نظر سے دیکھ کر مسکرا دے۔ وہاں شام اس حسین کی طرح معلوم ہوتی ہے جو زرنگار لباس میں حسن کو چار چاند لگا کر آغوشِ محبت میں چلی جانے کو بے قرار کھڑی ہو۔

باپ کے دل میں ملک کی محبت تھی۔ اس لئے اُس نے بیٹی کی مفارقت برداشت کر کے فرض ادا کیا۔ جوان جوڑا الفت اور عشق

سے سرشار ہوکر کٹھن منزل کو چل نکلا۔ فرض کے خشک ریگستان کو محبت کے رنگین تصوّر میں عبور کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ طبیعت سفر سے اکتا جاتی ہے جس مہم میں محبت کا عنصر نہ ہو اس کا سر ہونا مشکل ہے۔ ملک و ملّت۔ مذہب اور محبوب کسی کی محبت ہو تو انسان عزم میں پورا اترتا ہے۔ ورنہ چند قدم چل کر ہمّت ہار دیتا ہے۔

نوجوان جو حسن کی شہزادی نیلوفر کے ہاتھ پر ہوس کا بوسہ دے کر اُٹھے تھے چند منزلیں طے کر کے رہ گئے۔ جو نوجوان عشق کا عہد کر کے چلا تھا وہ بغداد کی سرور انگیز فضاؤں کو چھوڑ کر بمبئی کے عشق خیز شہر میں آگیا۔ اب وہ بازاروں میں مقصد کی تلاش میں پھرتا ہے۔ اسی طرح پھرتے پھراتے وہ چوپاٹی میں کھڑا تھا۔ ایک نوجوان لڑکے نے اُس کو ادب سے سلام کیا اور مؤدبانہ کچھ فاصلہ پر کھڑا ہو گیا گویا توجہ کا منتظر ہے۔ محسن نے عربی زبان میں کہا کہو عزیز میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟ اگرچہ میں غریب الدّیار ہوں پھر بھی ممکن سعی کو تیار ہوں محسن کو یہ خیال نہ رہا کہ وہ سرزمینِ ہند پر ہے جہاں ہر شخص زبان عربی سے آشنا نہیں۔ لیکن اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ جب اُس نے نوجوان کو نہایت عمدہ عربی زبان میں بے تکلّف جواب دیتے سنا۔

نوجوان۔ میں خود غریب الوطن ہوں۔ دنیا کی سیاحت کا شوق مجھے

یہاں لے آیا ہے۔ میری جیب میرے شوق کو پُورا نہیں کر سکتی۔ اس لئے ملازمت کی تلاش میں ہُوں۔

مُحسن ۔کیا ہندوستانی زبان سے واقفیت ہے۔

نوجوان ۔ بے تکلّف لکھ پڑھ اور بول سکتا ہُوں اور اس کے علاوہ فارسی اور انگریزی زبان میں بھی مہارت ہے۔ فرانسیسی کچھ کچھ سمجھ سکتا ہُوں۔

مُحسن ۔ اگر سامانِ سفر فراہم ہو تو کدھر کا ارادہ ہے۔

نوجوان ۔ جی ان پہاڑوں پر جانے کو چاہتا ہے۔ برف سے ڈھکی چوٹیاں جو انسانی سعی کو ناکام کرتی ہیں۔ جہاں کی دنیا آفتاب کی کرنوں کے پڑتے ہی جگمگا اُٹھتی ہے۔

مُحسن ۔ پھر تو مَیں بطور دوست کے ہمسفر ہو سکتا ہُوں۔

نوجوان ۔ نہیں جہاں آپ جانا چاہیں وہاں مجھے بطور خادم ہمرکابی کا فخر بخشیے۔

مُحسن ۔ جب مقصد ایک ہے، تو لفظی بحث میں نہ پڑنا چاہیئے۔ مجھے آج سے اپنی مہمانی کا موقعہ دیں اور مستقل طور پر میرے ساتھ رہیں۔ زبان انگریزی کچھ جانتا ہُوں۔ اُردو تھوڑا سمجھتا ہُوں۔ بہتر ہے کہ مجھے اُردو پڑھا کر شاگرد بنا لیں اور اس طرح شکریہ کا موقع دیں۔

نوجوان کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا اور اُس نے بڑھ کر محسن کا ہاتھ چوما اور بغیر مطالبہ کے عہد کیا کہ ہر حال میں وفادار ملازم رہوں گا۔

پُرجوش ملازم فرحت کو محسن کے پاس رہتے چند دن ہوئے وہ قابلیّت کے باعث مشیر اور خدمت کے باعث مخدوم ہو گیا۔ اور محسن اپنے عزیز سے بڑھ کر اس کی قدر کرنے لگا۔ ہر وقت دونوں اکٹھے رہتے اور کسی وقت ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے۔ ایک دن وہ اپنے آئندہ سفر کے پروگرام پر بحث کر رہے تھے۔ محسن ہری پربت کی سیر پر مصر تھا۔ مگر ہری پربت ہے کہاں اور اس میں کشش کیا ہے فرحت نے پوچھا؟

محسن۔ وہاں ایسی غیر فانی مخلوق آباد ہے جو انقلاب امم کی بہترین مبصر ہے۔ خواہش یہ ہے کہ ان سے استفادہ حاصل کر کے اقوام مشرق کی مصیبتوں کا حل پُوچھا جائے۔

فرحت۔ پاکیزہ مقصد کے لئے عزمِ بلند کی ضرورت ہے۔ اول تو یہ بات افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ سچ بھی ہو تو بھی غیر فانیوں کا مسکن عام آدمیوں کی دسترس سے ضرور دُور ہو گا اس لئے ہمیں اپنی ہمتوں کا اسی وقت جائزہ لینا چاہئے۔

کر چلے جاتے ہیں۔ بوالہوس خیرگیٔ نظارہ سے تڑپ اٹھتا ہے۔ جہاں حسن ریشم میں لپٹا اور لیونڈر میں بسا پھرتا ہے۔

فرحت اور محسن دونوں رنگ و بُو کے ماحول سے بے خبر بنچ پر بیٹھے لہروں کے ساحل سے ٹکرانے کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ اندرما بمبئی کی ایک شہرت یافتہ حسین بھی قرمزی ساڑھی پہنے اور قشقہ لگائے ساحل پر کھڑی لہروں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ اس کے بحرِ حسن پر مسرّت کی لہروں کو کنکھیوں سے دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ محسن و فرحت نے دیکھا کہ لوگ حیلہ و بہانہ سے کھسک کر قریب آ رہے ہیں۔ وہ ناز سے اٹھلاتی پرے چلی گئی۔ وارفتہ نوجوان آہستہ آہستہ نزدیک ہو گئے۔ وہ کچھ دیر وہاں ٹھہری پھر موٹر پر بیٹھ کر چلی گئی۔ ایک دن پھر ساحل پر یہ دونوں تلاشِ ناکام سے مضمحل ہوئے تھے کہ اندرما لبِ لعلین سے برقِ تبسّم گراتی۔ صدفِ بحر اٹھاتی اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ اس کی بے پروا مشغولیتوں کو لوگ دیکھ رہے تھے۔ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑھی پر گوٹا کناری لگا تھا۔ اس سروِ زرّیں نے اپنی نرگسی آنکھیں اٹھا کر محسن کی طرف اتفاقیہ دیکھا اثر پذیر دل اس کے پرتوِ جمال سے متاثر تو ہوا مگر ہمراہی سے کیفیت قلب چھپانے کی کوشش کی اور منہ پھیر لیا۔ دل نے پھر خوشگوار

مُحسن - ہمتِ مرداں مددِ خدا - فرحت تم اپنی ہمت کا جائزہ لو - تمہیں مجبور نہیں کرتا - مگر میں تو مصیبتوں کے پہاڑ سر پہ اٹھانے کا تہیّہ کر کے نکلا ہوں -

فرحت - خواہ تمہارا خیال ایک جانکاہ مذاق ہی کیوں نہ ثابت ہو - لیکن تمہارے عزم کی پختگی میری ہمّت کو بلند کر رہی ہے - اگر خدا نے توفیق بخشی تو ہمرہی کی سعادت کو ہاتھ سے نہ دوں گا - ہندوستان میں متعدد پہاڑ ہیں - کئی چوٹیوں کا نام ہری پربت ہے معلوم یہ کرنا ہے کہ غیر فانی مخلوق کی روایتوں کا حامل کونسا پہاڑ ہے - ہندو تہذیب اور سنسکرت زبان کے ماہرین ہی عقدہ کشائی میں مدد دے سکیں گے بمبئی میں ہر قسم کے لوگوں کے لئے کشش ہے ممکن ہے کہ یہاں تلاش کے بعد ایسے افراد مل جائیں جو رہنمائی کا باعث ہوں -

محسن نے خوش ہو کر فرحت کی طرف دیکھا - مُحسن اور فرحت دونوں ایسے پنڈتوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے - ایک دن بے سود تلاش سے اکتا کر شام کے وقت ساحل پر آ بیٹھے - شام کو ساحلِ بمبئی کا منظر ان دل پھینک آوارہ مزاج امرا سے پوچھئے جو دولت لٹاتے آتے ہیں اور بمبئی میں من برسا

نظارہ کا تکرار چاہا۔ آنکھیں چُرا کر دیکھا۔ فرحت نے دونوں کی چوری پر چشم پوشی کی۔ نگاہیں زمیں پہ گاڑ لیں۔ اندرما اور محسن کو محبت کی گھاتوں کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔

محبت کی محویّت کہو یا حسنِ اتفاق کہ اسی مقام پہ دوسرے روز پھر اندرما اور محسن دوچار ہو گئے محسن آج اکیلا تھا۔ اندرما قریب سے گذری۔ ہاتھ سے چھاتا گر گیا۔ بتقاضائے شرافت محسن نے اُٹھ کر چھاتا اُٹھایا اور نہایت ادب سے پیش کیا۔ اندرما نے دلنواز تبسّم اور شیریں زبان میں شکریہ ادا کیا۔ زبانِ اُردو سے ناواقف محسن اپنی بےبسی پر ہنس دیا۔ اس بے موقعہ ہنسی پر اندرما حیران سی ہو گئی۔ تب محسن کو اپنی حماقت کا احساس ہؤا عربی زبان میں عذرخواہ ہؤا۔ اندرما کی غلط فہمی دُور ہو گئی اور اُس نے گرمجوشی سے ہاتھ دبایا اور عربی زبان میں بولی کہ یہاں ساحلِ بحر کے باعث تمام معزز گھرانے عربی جانتے ہیں۔ میرے والد کا سارا کاروبار عربی ممالک میں تھا۔ مَیں آپ کے عذر کو معقول سمجھتی ہُوں۔ اُس نے اپنا کارڈ پیش کرتے ہوئے کہا۔ آپ اس پتہ پر آ کر مجھے میزبانی کا فخر بخش سکتے ہیں۔ عورت کی پیشکش کے ردّوقبول میں وہ جلدی فیصلہ نہ کر سکا۔ اندرما کا رنگ زرد ہو گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ نوجوان دانستہ میری

ذلت کا مُوجب ہُوا ہے۔ اور وہ دل شکستہ ہو کر وہاں سے چلی گئی۔
دوڑ کر معذرت کرے یا نہ کرے وہ پھر تذبذب میں پڑ گیا۔ جب وہ
موٹر میں بیٹھ کر نظروں سے غائب ہو گئی تو افسردہ سا ہو کر ہوٹل
میں آ گیا۔ اور دن تک اداس بیٹھا رہا۔ صُبح اُٹھا پھر کپڑے بدلے
اندرما کا ملاقاتی کارڈ لے کر باہر چل دیا۔ پُوچھتا پوچھتا ہندو آبادی
کوٹھی نمبر ۱۵ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ کوٹھی نمبر ۱۲ سے ایک متین
نوجوان نکلا۔ اس سے دریافت کیا کہ کوٹھی نمبر ۱۵ میں کون رہتا ہے،
اُس نے کہا یہاں ایک دوشیزہ رہتی ہے۔ جس کا باپ حال ہی
میں مرا ہے۔ مگر بلا خاص اجازت کے وہ کسی سے ملنا گوارا نہیں
کرتی۔ نہ عام طور پر وہ کسی سے بات کرتی ہے۔

محسن کو اندرما کے آبرو باختہ ہونے کا گمان ہو گیا تھا۔ اس
لئے قبولِ دعوت کے متعلق تذبذب پیدا ہو گیا تھا۔ اب دل میں شرمندہ
تھا اور تذبذب کی جگہ عذر خواہی کے جذبہ نے لے لی تھی۔ وہ حوصلہ
کر کے اندر گیا۔ اندرما کے کارڈ کے ساتھ اپنا کارڈ ملازم کو دیا۔ تاکہ
ملاقاتی کے متعلق اطمینان ہو جائے کہ وہ کون سا شخص ہے۔ اندرما نے
محسن کو فوراً اندر بُلا لیا۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر سُوجی ہوئی تھیں۔
محسن نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ محترم خاتون میں اپنی حرکت پر

شرمندہ ہُوں ۔معافی مانگنے آیا ہُوں۔
اندرما۔آپ اپنے طرزِعمل میں حق بجانب تھے ۔عورت جو مرد کی مُلاقات کا شوق دل میں رکھ کر موقع کی تلاش کرے اس کی یہی سزا ہے کہ مرد اُسے گناہ کی جستجو میں آوارہ سمجھ لے۔
محسن ۔میرا دل اِن شبہات سے پاک ہے۔
اندرما ۔مجھے آپ کے متعلق یہی نیک گمان تھا۔مگر قدرت نے مجھے بغیر ولی کے چھوڑ رکھا ہے ۔ہر شخص میری خلوت اور اس کے مشاغل پر معصوم ہونے کا گمان نہیں کرتا ۔لوگ کہتے ہیں مَیں حسین ہُوں ۔مگر حسن میرے لئے وبالِ جان ہے ۔ جدھر نکلوں اوباشوں کی نظریں اٹھتی ہیں اور آوارہ مزاج لوگوں کی زبانیں دراز ہو جاتی ہیں ۔مَیں یورپین کالج کی تعلیم یافتہ ہُوں ۔میری عادات اور حرکات آزاد ہیں ۔ باوجود میرے تعلیمی ماحول کے سوائے شام کی سیر کے مجھے مصروفِ مطالعہ رہنا پڑتا ہے ۔ سوائے آپ کے میرے دل میں کسی نوجوان کے لئے کشش پیدا نہیں ہوئی ۔ دو دن کے غور و خوض کے بعد اس امید پر آپ سے ملاقات کی راہ پیدا کی تھی ۔کہ آپ سے راہ و رسم کسی انسانی کمزوری پر منتج نہ ہوگی۔

اگرچہ اُس نے حسن کا ذکر کر دیا مگر مقصد حسن کی طرف متوجہ کرنا نہ تھا۔ اُس کے چہرے پر متانت اور سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے محسن کے دل میں رحم بھری محبت کا احساس تھا۔ مگر پہلی ملاقات کو طول دینا مناسب نہ سمجھ کر اُس سے رخصت مانگی۔

دوسرے روز سمندر کے جان فزا مناظر میں اندرما کی مسرت خیز ملاقات نے اور دلچسپی پیدا کر دی۔ فرحت اور محسن شور انگیز موجوں کا ساحلِ بحر سے ٹکرانے کا لطف اُٹھا رہے تھے کہ وہ آئی اور پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ اِدھر اُدھر نہ دیکھتی تھی۔ گویا غروب آفتاب کے نظارے میں ایسی کھوئی ہے کہ دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں۔ اندرما کی اس ادا نے محسن کی طبیعت میں شوخی پیدا کر دی۔ وہ بے پہچان سا ہو کر اندرما کے آگے کھڑا ہو گیا۔ آخر اندرما مجبور سی ہو کر مسکرا دی۔ اور محسن کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ناز و ادا کے اس نظارے کو فرحت نے تعجب سے دیکھا۔ محسن اور اندرما دونوں اپنی اس حرکت سے خود ہی خفیف سے ہو گئے اور محسن نے کھسیانا سا ہو کر اندرما کا فرحت سے تعارف کرایا کہ یہ میرے عزیز دوست فرحت ہیں۔

فرحت نے لکھنوی انداز سے سلام کر کے کہا نہیں بیگم صاحبہ میں ان کا ادنیٰ خدمت گذار ہوں۔

اندرما نے کہا۔ مَیں آپ دونوں کو سچّا سمجھنے کی کوشش کر رہی ہُوں۔ آپ کے لباس میں تو فرق نہیں۔ اب درجے کا یقین کس طرح کروں۔

فرحت کا علم پاسِ ادب سے شکست کھا گیا۔ اور وہ طبیعت کی روانی کے باوجود وہ دست بستہ اور لب بستہ ہو کر رہ گیا۔ صرف اتنا کہا کہ لباس کی خُوبی اِن کی مہربانی ہے۔

محسن نے اندرما اور اپنے طرزِ عمل کے جواز میں خود بخود حُجّت پیش کرتے ہوئے کہا۔ کہ اندرما یورپین کالج کی تعلیم یافتہ ہے طبعی شرافت کے باوجود اس میں مُغربیوں کی سی بے حجابی اور بے باکی ہے۔

فرحت۔ مَیں نے تو حرف گیری نہیں کی میرے مالک

محسن۔ نہیں مَیں صرف تعارف کرا رہا ہُوں۔

اندرما کی رات بے چینی سے کٹی۔ لیکن طبیعت پریشان حالی کی وجہ نہ سمجھ سکی۔ اگلے دن وہ محسن کے ہوٹل میں خود ہی چلی آئی۔ آقا اور ملازم آمنے سامنے بیٹھے ہندوستان کی سیاسی حالت کے متعلق گفتگو میں مصروف تھے۔

محسن نے کہا۔ کہو اندرما ۳۵ کروڑ انسانوں کو چند لاکھ انگریز بھیڑ بکری کی طرح سے کیونکر ہانک رہے ہیں۔

اندرما نے خوبصورت چہرے کو ریشمی رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا - مَیں مسائل کی بہتر مبصر نہیں لیکن میری پرنسپل اکثر ان مسائل پر بحث کرتی تھی - وہ اپنی زندگی بھر کے تجربہ کی بنا پر کہا کرتی تھی - کہ ہندوستان کی فطرت میں غلامی ہے - بچوں کو گھر میں آزادی سے سانس لینے اور دم مارنے کی اجازت نہیں ہوتی - ان کی شخصی ترقی کی دعائیں مانگی جاتی ہیں - اور ذاتی وجاہت کی آرزو کی جاتی ہے - مگر ملک کی خدمت اور قوم کی فلاح کے جذبہ میں مائیں خود کوری ہوتی ہیں - اس لئے بچوں میں اجتماعی مفاد کے لئے قربانی کا ذوق پیدا نہیں ہوتا - بچے کبھی کبھی جذبۂ انتقام کو بروئے کار دیکھتے ہیں اور ماؤں سے سُنتے ہیں کہ بچہ جوان ہو کر چچا سے باپ کی بدسلوکی کا بدلہ لیکر میری آتشِ انتقام کو بجھاتا - لیکن یہ بات ان کے کان میں نہیں پڑتی کہ برخوردار جوان ہو کر اپنی جان کو ملک کے لئے قربان کرنا -

کھُلی کھڑکی سے ہوا کے ایک تیز جھونکے نے بالوں کو چہرے پر بکھیر دیا - اور دوپٹہ سر سے سرک گیا - اندرما بال اور دوپٹہ درست کر کے پھر بولی -

جس طرح گھر کی خوشحالی اور امن خاندان کی یکجہتی پر موقوف ہے - اسی طرح ملک کی فلاح اور آزادی مشترکہ مفاد کی حفاظت

اور اجتماعی قربانی پر منحصر ہے۔ آزاد ممالک کے لوگ ہمسایہ کے مفاد کے لئے قربانی کرنے پر فخر کرتے ہیں۔ ہندوستان کا ہندو مسلمان ایک دوسرے کو دُکھ پہنچانے کے لئے اپنا سُکھ قربان کرنے کے لئے تیار رہے۔ ایسے بدنصیب لوگوں پر چند لاکھ کیا چند ہزار آدمی حکومت کر سکتے ہیں۔

اندرما نے دیکھا کہ اہلِ ملک کے اس حقیقت حال سے فرحت کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو آگئے ہیں تعلیمِ مغرب سے آراستہ عورت بھی آخر عورت ہے۔ وہ ازل سے اثر پذیر دل لے کر آئی ہے۔ اور ابد تک یونہی ماحول سے متاثر ہوتی رہے گی۔ فرحت کی ڈبڈباتی آنکھوں کو دیکھ کر وہ خود رونے لگی۔ اس کی آنکھیں شراب ارغوانی کا چھلکتا ہوا پیمانہ بن گئیں۔

محسن حیران تھا کہ سیاست کے خشک مضمون میں آنسوؤں کی اس روانی کو کیونکر روکے جنسِ لطیف پر تو لطف و نوازش کو ہی مناسب سمجھا مگر فرحت کو محسن نے مخاطب کر کے کہا۔ یہ سنتا تھا کہ ہندوستان کے مرد عورتوں کی طرح رو دیتے ہیں۔ آہنی عزم لیکر اُٹھنے کی بجائے ارادہ کو آنسوؤں میں بہا دیتے ہیں۔

معلُوم نہیں کہ یکایک کیا سُوجھی اندرما کی طرف متوجہ ہو کر

بولا۔ اندرما کیا تمہاری یورپین پرنسپل نے ہندوستان کی غلامی کا یہ سبب نہ بتایا تھا کہ ہندوستان کا مرد عورت سے زیادہ رقیق القلب ہے۔

محسن کا یہ فقرہ فرحت اور اندرما کیلئے نوکِ سنان بن گیا جس سے دونوں سنبھل بیٹھے۔ صحبتِ امروزہ ناخوشگوار طریق پر ختم ہوگئی۔ محسن نے ہر چند چاہا کہ سلسلہ کلام کسی طرح جاری رہے۔ لیکن فضا میں ندامت کی برچھیاں تیرتی تھیں۔ یہ ماحول مزید گفتگو کا متحمل نہ تھا۔ دلگرفتہ اندرما رخصت لے کر آگئی۔ فرحت سرگرانی کا بہانہ کر کے پڑ رہا۔

محسن اپنے غیر محتاط طرزِ کلام سے خود ہی آزردہ خاطر ہوگیا کئی روز نفس کی شوخی پر شرمندہ رہا۔ زمانہ زخموں کا بہترین مرہم ہے جب چند روز کے بعد طبیعت بحال ہوگئی تو محسن اور فرحت اندرما کے ہاں گئے۔ وہ بھی زخم کو بھول چکی تھی۔ بڑے تپاک سے پیش آئی محسن نے آج محسوس کیا کہ اگرچہ اس کی خاطر و مدارات میں کمی نہیں آئی لیکن اندرما کی توجہ کا مرکز فرحت ہے۔

اگرچہ عورت بدنام ہے لیکن مرد تمام عورتوں کی توجہ کا مرکز بننے کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ شہزادی نیلوفر اس کے خوشگوار خوابوں کی دیوی تھی۔ پھر بھی اس کے دل میں غیر مرئی خواہش موجود

تھی کہ اندرما اس کے لئے بیقرار رہے ۔ یہ دیکھ کر کہ اندرما کا مرکز قرار کوئی اور ہے وہ بیقرار سا ہو گیا۔

عام طور پہ یہ ناقابلِ برداشت امر ہے کہ ایک ملازم اپنے آقا کی دل بستگی کے سامان کو ہتیا لے جائے ۔ مگر محسن کی طبعی شرافت بر روئے کار آئی ۔ اس نے اس ذلت کو شہیدِ الفت کے اطمینان سے برداشت کیا ۔ اور اندرما کی نگاہِ ناز کو فرحت جیسے بے نیاز پر پڑنے کا نظارہ دیکھتا تھا ۔ ماتھے پر شکن یا آنکھوں میں اضطراب پیدا نہ ہونے دیتا تھا ۔ سمجھدار عورت ہوشیار مرد کو بھی نگاہوں میں چھانتی ہے محسن کی ہلکی سی سرد مہری سے فرحت کے لئے اپنی گرمجوشی کے افشا کا یقین ہو گیا ۔ عورت ہمیشہ محبوب کی محبت کو اوروں سے چھپانا پسند کرتی ہے ۔ اِس لئے اس نے فوراً محتاط رویہ اختیار کیا ۔ اور فرحت کو اپنی گفتگو میں قطعی نظر انداز کر دیا ۔ محسن یہ باور کرنے پر مجبور ہو گیا ۔ کہ اس کی وہ نگاہیں جو شبہ کا باعث ہوئیں ۔ اس کے وہم کی پیداوار ہیں ۔ اور اندرما کو اپنی طرف پہلے سے زیادہ متوجہ پا کر خوشی سے انگڑائیاں لینے لگا۔

فرحت اندرما کی تمام گفتگو کی تکمیل چاہتا تھا ۔ اس نے اندرما کو کہا ۔ اندرما تمہاری پرنسپل کے سیاسی نصائح سے اس ع ونڈ

پُورا فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ بات اچانک ختم ہو گئی۔

اندرا بولی کہ مَیں سلسلہ کلام کو پُورے طور سے جاری نہ رکھ سکوں گی۔ البتہ اپنی پرنسپل کی دل نشین کہانی سناتی ہُوں۔

ایک ہندوستانی لڑکی نے شوخی سے پُوچھا کہ یہ آزادی آزادی جس کا اتنا نام ہے کہاں پیدا ہوئی کہاں رہتی ہے۔ اور اسے کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ہماری یورپین پرنسپل نے مسکرا کر کہا۔

آزادی۔ ملکہ فطرت کے بطن سے چندے آفتاب چندے ماہتاب شہزادی پیدا ہوئی۔ وہ دن بھر باغ میں تیتریوں سے کھیلتی اور رات کو پھولوں پر سوتی تھی۔ جب جوان ہوئی تو دنیا کی بہترین مشاطہ گر تزئینِ حسن کے لئے مقرر کی گئی۔ اس کے دلنواز تبسم سے قلوب پر اُجالا سا ہو جاتا تھا۔ نگاہیں جدھر اٹھتی تھیں بجلی کوند جاتی تھی۔ وہ پہاڑی پر چڑھ کر بنسری بجاتی تھی جنگل کے جانور سمٹ کر آ جاتے تھے۔ وہ غزالوں کو پہروں پیار کرتی تھی اور ان کو چُومتی تھی۔ اس کی آزاد مشغولیتوں اور بے باک مصروفیتوں کے باعث عُمدہ صحت نے قدرتی حسن میں ہزار اداؤں سے بہتر رنگ پیدا کر دیا۔ سیب قندھا اور لعلِ بدخشاں اس کے پرتوِ حسن کی ادنیٰ جھلک تھے۔ شہزادی کو

سُرخ رنگ سے عشق تھا۔سرخ ریشم کا لباس زیب تن کرتی اور سرخ پھولوں کا ہار پہنا کرتی۔

منجموں نے زائچہ دیکھ کر کہا کہ شبھ لگن آگیا ہے۔

ملکہ چاہتی تھی کہ شہزادی کی افتادِ مزاج کے مطابق ایسا بر ملے جو اس کی حفاظت کا ضامن ہو۔چنانچہ اُس نے شہزادی کو ایک ایسے خوبصورت جزیرے میں آباد کر دیا۔جو خُون کی خلیج سے گھرا ہُوا تھا۔تاکہ ہر دعویدار خُون کی ندی تیر کر آئے۔کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بُزدل خُون میں تیر کر نہیں آسکتے۔

گو جزیرہ ہزار جلووں کی جنت گاہ تھا۔اس کے دلفریب مناظر دامنِ دل تھام لیتے تھے لیکن خلیج کے سرخ خُون کی آہستہ خرامی شہزادی کو مبہوت کر دیتی تھی۔ وہ گلرو بادۂ گلگوں سے خوش کام ہو کر شہیدوں کی تعریف میں جنگی ترانے گاتی تھی اور مظلوم کے اس خُون کی توصیف جو راہِ حق میں بہہ جاتا ہو اس جذبہ سے کرتی کہ اس کی آنکھیں جوش سے لالہ زار بن جاتی تھیں۔

بچیو! آزادی فطرت کی خوبصورت ترین بیٹی ہے اسے صرف خون میں تیر کر حاصل کر سکتے ہیں۔"

پھر ان مسرت خیز ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا محسن نے

ایک دن دل کا جائزہ لیا۔ ڈر گیا۔ مبادا یہ ملاقاتیں محبت کی صورت اختیار کرلیں۔ فطرتِ انسانی کی کمزوری اچانک گہرے پانیوں میں لے جاتی ہے۔ وہ محبت کا عہد بغداد میں باندھ چکا تھا۔ اس بہشت سے نکلنا اسے گوارا وہ نہ تھا۔ تاہم اندر ماہیں ایسی جاذبیت بھی کہ بمبئی میں رہ کر اس سے دُور رہنا بھی ناممکن تھا۔ ایک رات محسن اپنی پریشانیوں کے باعث بے قرار تھا۔ فرحت سے بولا۔ تم جہاں دیدہ ہو۔ کوئی ایسی کہانی سناؤ یا وہ تجربہ بیان کرو جو سکونِ قلب کا باعث ہو۔

فرحت نے کہا۔ مجھے خوف ہے کہ بے ضرورت تعریف مجھ میں بے جا غرور پیدا نہ کردے۔ تاہم تعمیلِ حکم کیلئے حاضر ہوں۔

کہانی

خاندیس کے ایک حکمران کی کہانی بیان کرتے ہیں جس کی قلعہ بندیاں ناقابلِ تسخیر تھیں۔ اور وہ دشمن سے مطمئن زندگی بسر کرتا اکلوتی بیٹی آنکھوں کا نُور اور محل کی رونق تھی۔ وہ کلی کی طرح مسکراتی اور پھول کی طرح ہنستی تھی۔ جوان ہو کر سہیلیوں کے جھُرمٹ میں چاند کی طرح تاروں میں گھری معلوم ہوتی تھی۔ لاڈلی بیٹی کے معصوم

قہقہوں سے فضا گونج اُٹھتی تھی۔ روپ دھار کر وہ مختلف شکلیں بنا کر آتی اور ماں باپ کو بھول میں ڈال کر باغ باغ ہو جاتی۔

لڑکی بیگانہ دھن ہے۔ مناسب بر کی تلاش شروع ہوئی۔ راج رانی کو اصرار تھا کہ کلی کیلئے کوئی پھول چاہیئے۔ تلاش کے بعد گجرات کا ایک نوجوان بَر پسند آیا۔ جو حسن و جمال کے لحاظ سے اپنا جواب آپ تھا۔ جب رسومات بیاہ ادا ہوئیں تو دلہا دلہن پاس کھڑے یُوں معلوم ہوتے تھے۔ گویا دیوتا دیوی درشن دینے کے لئے زمین پر آ گئے ہیں۔ غرض نوجوان کو گھر جمائی رکھ کر گدی کا وارث قرار دیا۔

عشق کی آغوش میں حسن ایک سال نہ رہنے پایا تھا۔ کہ آسمان نے رنگ بدلا۔ چند ملازمین کی نمک حرامی نے غنیم پر قلعے کے دروازے کھول دئیے۔ نوجوان جوڑا پرانے وفادار سرداروں کی مدد سے جُوں توُں کر کے جان بچا کر نکل گیا۔ دونوں کو تخت سے اُتر کر فرش پر سونا پڑا۔ راج کھو کر حاصل کرنے کے لئے پتھر کا دل اور شبر کا جگر چاہیئے۔ میاں بیوی دونوں معشوق صفت اور عاشق مزاج تھے۔ محبت کی جنگ میں کمان ابرو سے نگاہوں کے تیر تو برسا سکتے تھے۔ مگر دشمن سے پنجہ آزمائی ان کے بس کا روگ نہ

تھا۔ تاہم حالات سے تنگ آکر ایک دن نوجوان خاوند نے پیاری بیوی سے بڑے عزم کا اظہار کیا۔ کہ تم جُوں توں کر کے مزدوری سے پیٹ پالو۔ مَیں ہمت کر کے بیکاروں اور آوارہ مزاجوں کا دستہ تیار کر کے ایک دفعہ قسمت آزمائی کرتا ہُوں۔ عورت کو مرد جس سانچے میں ڈھالے ڈھلتی ہے۔ ایک گاؤں میں رہ کر چکّی کی مشقّت اور مفارقت کی مُصیبت برداشت کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ نَوجوان تدبیر کو تقدیر سے ٹکرانے کے لئے ایک بڑے شہر میں داخل ہُؤا۔

بھُوکوں سے جان جوکھوں کا کام لینا آسان ہے۔ بشرطیکہ انہیں سبز باغ دکھانے میں محنت سے کام کیا جائے۔ اور انہیں سمجھانے۔ بھڑکانے اور منظم کرنے میں کافی مدّت صرف کی جائے صرف ایسا دماغ انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ جو بھوکوں کو کامیابی سے فکرِ فاقہ سے آزاد ہو جانے کا یقین دلائے۔ اس نے کام کی ابتدا نہایت خُوبی سے کی۔ اپنے حواریوں کا حلقہ بنایا۔ ان کے دماغ کو خوش آئند امیدوں کی جولانگاہ بنا دیا۔ وہ فاقوں میں بھی بلند ارادوں کے نشوں میں سرشار رہنے لگے۔ نَووارد نوجوان شہر کے اندر ایک مستقل طاقت بن گیا۔ مفلسوں کا سردار سرمایہ داروں کے لئے محلِ ادب قرار پایا۔ شہر میں کَون تھا جو نظر اٹھا کر دیکھے

اور دُور سے کھڑا اسلام نہ کرے۔ بُرے حالات میں اُس نے بھی مفلسی کا لباس اتار دیا۔ سفید پوشی نے خوشروئی میں اضافہ کیا۔ اور وہ سپاہیانہ انداز میں مونچھوں کو اونچا کر کے چلنے لگا۔ نازنینوں کی نگاہیں محبت سے اُٹھنے لگیں۔ مگر بیوی کی محبت اس کے لئے ایسا حصار تھی جس کے باعث جادُو بھری نظریں بھی بے اثر تھیں۔ اس کے سامنے مقصد بلند تھا۔ بیوی عالمِ خیال میں اپنی بے بسی کی کہانی کہہ کر آمادۂ کار رکھتی تھی۔ اور وہ اپنی محنت سے شہر کی غریب آبادی میں بیش از بیش اثر استعمال کرنے لگا۔ اس نے ان کو جتھوں میں تقسیم کر کے اِن پر سالاروں کو مقرر کیا۔ کچھ کچھ سپاہیانہ کھیلیں کرانے لگا۔

ایک بیوہ نے ہمت افزائی کے طور پر اس کی مالی امداد کا وعدہ کیا۔ اور آہستہ آہستہ اب موقعہ یہ پہنچ گیا جب کہ وہ تکمیلِ مقصد کے لئے نکلے اور شب خون مار کر اچانک قلعہ پر قابض ہو جائے لیکن بیوہ اور نوجوانوں میں آزادانہ راہ و رسم نے ایک دوسرے کے لئے ابتدا میں ہمدردی اور آخر میں محبت پیدا کر دی۔ محبت کی رنگین وادیوں میں کھو کر وہ اس مقصد کو بھول گیا۔ جس کے لئے ناز و نعمت میں پلی بیوی کو چکی پیستے چھوڑ آیا تھا۔ محبت کی پُر فضا

وادی کو چھوڑ کر میدانِ جنگ کو وہی سدھارے جو فطرتاً سپاہی اور بہادر ہو۔ مگر جنہوں نے عمر بھر آرائش کے سوا کچھ نہ سیکھا ہو۔ وہ عزم صادق سے کر اٹھیں بھی تو جلدی ہمت ہار دیتے ہیں۔

فرحت اتنی کہانی کہہ کر خاموش ہو گیا۔

مُحسن جو کہانی میں محو تھا پکار اُٹھا کہ آگے کیا ہوٗا فرحت؟

فرحت نے کہا۔ میں بُھول گیا کہ انجام کیا ہوا۔ میں باقی حکایت کل سوچ کر بتاؤں گا۔

محسن نے جوش میں کہا کہ ہم یہاں نہیں رہیں گے

فرحت۔ تو کہاں کا ارادہ ہے صاحب۔

محسن۔ ان پہاڑوں پر گھومنے جاؤں گا جن کی طرف تم نے پہلی ملاقات میں اشارہ کیا تھا۔

فرحت۔ ایسی کیا جلدی ہے آقا۔ ابھی چند دن اور اس دلکش مقام کی سیر کریں۔

مُحسن۔ تم رہ سکتے ہو۔ مگر میں ان پہاڑوں کی سیر ضرور کرونگا۔ اور کل ہی صبح روانہ ہو جاؤں گا۔

فرحت۔ ایسی بھی آفت کیا پڑی ہے آقا۔ دو چار دن اور....

محسن۔ نہیں فرحت ایک دن بھی اور نہیں۔

فرحت - یہ ہندوستان ہے - یہاں بیسیوں برف پوش پہاڑ آسمان سے باتیں کرتے ہیں - وہی مشکل ابھی حل طلب ہے کہ ان روایات کے حامل پہاڑوں کا پتہ کس سے پوچھیں -

محسن - ہمیں یہاں سے ضرور بنارس جانا چاہیئے تمام لوگوں نے تو اس جگہ جانے کی سفارش کی ہے -

---

روانگی صبح اندرما کو بھی اطلاع دے دی گئی - وہ محسن کی یکایک تیاری کا سُن کر حیران ہو گئی - روانگی کے وقت سٹیشن پر آ گئی محسن مجرم کی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا -

اندرما نے پوچھا - اچانک کیا کام پڑ گیا محسن ! کیا مجھ سے خلافِ مزاج کوئی بات تو نہیں ہو گئی -

محسن شرمندہ تھا - کیا محبّت کا غدّار دل لے کر جاتا پکڑا گیا - نہیں یہ نوبت بھی نہ پہنچی تھی - تاہم دونوں میں دل بستگی ضرور تھی - اگر محسن مشورہ کر کے چلتا تو اندرما کو بھی صدمہ نہ ہوتا - اور خود بھی شرمندہ نہ ہوتا - لیکن شبِ گذشتہ فرحت کی بیان کردہ کہانی سے اسے خیال ہُوا کہ وہ شہزادی نیلوفر کی محبت کا وفادار نہیں - اس سے جس کام کا وعدہ کر آیا تھا وہ ابھی تشنہ تکمیل ہے - اور وہ بمبئی میں پڑا

خوش گپیوں میں مصروف ہیے۔

فرحت اسبابِ سفر رکھوا کر کھڑکی سے سر نکال کر محسن کے ساتھ ہی دوسری گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گارڈ نے سیٹی دی۔ اندرا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے

محسن نے آج پھر محسوس کیا کہ اندرا اگرچہ اس سے مخاطب تھی لیکن فرحت کو محبت کی نظروں سے تاکتی تھی۔ گاڑی جب روانہ ہوئی تو اندرا کی غمگین اور غمناک نگاہیں فرحت کی کھڑکی کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگیں۔ اس نے رنگین رومال ہوا میں لہرا کر الوداع کہی محسن کی نگاہ سے بچ کر رومال کی اوٹ میں فرحت کو محبت سے دیکھتی رہی محسن کی طبیعت نے پہلے ہی شک قبول کر لیا تھا۔ اب تو یقین ہو گیا کہ رومال کی اوٹ میں دل شکار کیا جا رہا ہے۔

محسن دل شکستہ سا ہو کر بیٹھ گیا۔ گویا سبز باغ دکھا کر کسی نے لوٹ لیا ہو۔ جب گاڑی سٹیشن سے نکل آئی تو محسن نے از راہِ تجسس کہا۔ کہ بمبئی سے نکل کر مَیں صدمہ محسوس کر رہا ہوں۔ کچھ تم بھی تو آزردہ خاطر معلوم ہوتے ہو فرحت؟

"نہیں میرے مالک"۔ فرحت نے کہا۔

محسن۔ کیا تم طبیعت پر بار محسوس نہیں کرتے؟

فرحت - بلکہ میری طبیعت تو ہلکی معلوم ہوتی ہے۔

محسن نے فرحت کی طرف دیکھا - اس کے چہرے پر افسردگی کا نشان تک موجود نہ تھا - اندرما پر غصہ آنے کی بجائے اس کے لئے دل میں رحم کے جذبات پیدا ہو گئے - عورت کا حُسن ایک لاپروا نوجوان کے پاؤں گر کر توجہ کی التجا کرے - کتنا غم انگیز تصوّر ہے - اس خیال نے اسے پہلے سے زیادہ افسردہ کر دیا - پھر تھوڑے سے سکوت کے بعد فرحت کو کہنے لگا -

"فرحت - اندرما سے تیرا یہ تغافل"؟

"کون سا تغافل"؟ فرحت نے حیران ہو کر پوچھا -

محسوساتِ قلب کو کس زبان سے بیان کرے اور کرے بھی کیونکر فرحت کا معصوم چہرہ رازِ محبت کا غماز نہ تھا - الزام لگا کر محسن خود جھوٹا ثابت ہو رہا تھا - فرحت جواب کا منتظر تھا - محسن کو بھاگنے کی کوئی جگہ نہ تھی - جواب دینا تو کیا لاجواب ہو کر کہا کہ کچھ مغالطہ ہو گیا تھا -

فرحت اور حیران ہو کر پوچھنا چاہتا تھا کہ مغالطہ کس بارے میں - لیکن محسن کو کچھ شرمندہ سا دیکھ کر مزید استفسار کی جرأت نہ کی -

گاڑی بھاگی جا رہی تھی محسن میٹھا محرومِ محبت اندرا کے لئے غم کھا رہا تھا۔ اس نے دل میں کہا اندرا اگرچہ آزاد خیال ہے۔ لیکن جنسی خطاؤں سے اس کا دامن پاک ہے۔ ایسی عورت کی محبت کا ٹھکرائے جانا افسوسناک ہے۔ چنانچہ حوصلہ کر کے پھر فرحت کو مخاطب کیا۔

"اندرا تم پر فدا ہے فرحت مگر تم ......"

فرحت۔ فدا، اندرا۔ مجھ پر ——— انہیں آپ کو مغالطہ ہو گیا ہے۔ ہاں بمبئی سے چھٹ کر آپ کی سرگرانی البتہ مجھے شاق گذر رہی ہے۔

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ فرحت کو یہ خیال تھا کہ محسن کو اندرا کی جدائی ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے محسن کو خیال تھا کہ اندرا فرحت کی مفارقت سے بے چین ہو گی محسن خود محبت کی چوٹ کھائے ہوئے تھا۔ اندرا کو بھی زخم خوردہ سمجھ کر محتاجِ توجہ سمجھنے لگا چاہتا تھا کہ دونوں کو ملانے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن گاڑی قطعِ منازل کرتی جا رہی تھی۔ اور اس کی کامیابی کے امکان کو دُور کر رہی تھی۔

خیال نے محبت کی کہانی کا سین بمبئی سے بغداد بدل دیا شہزادی نیلوفر تصور میں سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اور اس کے قیامت

قامت نے عالمِ خیال میں محشر بپا کر دیا۔ وہ باغ کی روشوں پر اخلاقی گیت گاتی اور ستار بجاتی تھی۔ اس نے دلکش آواز سے محبت کا وہی میٹھا راگ گایا۔ جو تالاب کی مرمریں سیڑھیوں پر بیٹھ کر اس نے پہلے گایا تھا۔ وہ مدّت تک اس کے حسین تصور میں تصویر بنا بیٹھا رہا۔ اس محویّت کے بعد بھی خوشگوار راگ کے دلکش نغمے دیر تک کان میں گونجتے رہے۔ یونہی سوتے جاگتے خیال جاناں کے جاں نواز تصورات میں محسن اپنے ساتھی کے ساتھ بنارس اُترا۔

نشان یہاں بھی وہ ہری پربت کا نشان اور غیر فانی مخلوق کا پتہ پُوچھتے پھرے۔ بالآخر وید شاستروں کے ایک معمّر ماہر کو معقول بھینٹ دی۔ تاکہ وہ قیمتی وقت کی قربانی کر کے انکی مناسب راہنمائی کرے۔

پنڈت ودیا ساگر جو آنکھیں وید خوانی کی نذر کر چکا تھا۔ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کہا سنو بالک!

شاستروں میں ہری پربت کا نام تو آیا ہے۔ پرنتو کٹھن راستے کے کارن کوئی وہاں نہیں پہنچا۔ بعض لیکھوں میں ہے کہ پہلے کشمیر جائے جہاں پھولوں سے ڈالیاں جھکی رہتی ہیں اور پنچھی اینک راگ راگنیاں

گاتے ہیں۔ وایوبین اور امرت جل جھرجھر کر طنبور بجاتے ہیں۔ یہاں سے آگے لدّاخ کا ملک پڑتا ہے۔ اس کے آگے ہری پربت ہے۔ جہاں رشی منی رہتے ہیں۔

محسن اتنا پتہ پاکر خوش ہوگیا۔ بنارس سے دونوں آگرے چلے آئے آگرے سے دہلی پہنچے۔ دونوں جگہ شاہی عمارتوں کو دیکھا۔ دل میں ہوک سی اُٹھی۔ تعجب کیا کہ عظمتِ گذشتہ کے ان نشانات کی موجودگی میں لوگ جذبۂ آزادی سے عاری ہیں۔ لیکن پھر آہِ سرد بھر کر کہا۔ قومیں جب احساس سے عاری ہو جاتی ہیں تو عظمتِ گذشتہ کے افسانے ناخوشگوار کہانیوں کی طرح گوش کے لئے گراں ہو جاتے ہیں۔ آثارِ صنادید بزبانِ حال سے انقلاب کی دعوت دیتے ہیں لیکن ان کی زبان کو سمجھنے کی قابلیت مفقود ہو جاتی ہے۔ زبان اور عمل کی ساری خوبیاں جاتی رہتی ہیں۔ ان کی خوشیوں کا منبع بدگوئی اور باہمی جھگڑے ان کی دلچسپیوں کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔ وہ لوگ اپنی برپاکردہ مشکلات میں پھنسے عمر ضائع کر دیتے ہیں۔ کسی کے کام آنے کی بجائے اوروں کی راہ کے کانٹے بنے رہتے ہیں۔

ایک رات محسن دہلی کے ہوٹل میں پلنگ پر لیٹا ہندوستان کی گذشتہ عظمت اور موجودہ انحطاط پر غور کر کے بے چین ہو رہا تھا۔ اس

نے کہا فرحت تمہیں وہ بھولی ہوئی کہانی یاد نہیں آئی کیا وہ بمبئی کا افسانہ دہلی میں ختم نہ کر دو گے۔

فرحت نے کہا۔ مَیں وقتاً فوقتاً حافظہ پر زور دیتا رہا ہُوں۔ مَیں آج آپ کو کچھ بے چین سا دیکھتا ہُوں۔ اس لئے عرض کئے دیتا ہُوں ممکن ہے کہ یہ قصّہ سکون کا باعث ہو۔

بقیّہ کہانی

ہاں میں یہاں تک کہہ چکا تھا کہ امیر زادہ نے نوجوان بیوہ کے ساتھ راہ و رسم پیدا کر لی۔ بیوی کی محبت اور مقصدِ سفر کو بھول کر اپنے لئے اس نے دلچسپیوں کی نئی دنیا بنالی تھی۔ پہلے تو محبت ناموں میں بے قراری کا اظہار کرتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ خطوط نویسی کے ولولے سرد ہونے شروع ہو گئے۔ کئی مہینوں تک چھٹا پُرزہ بھی نہ بھیجا۔ بیوی کی بہشت خاوند کی محبت ہے۔ وہ غمِ فراق میں کباب سیخ ہو گئی۔ پہلو بدل بدل کر راتیں آنکھوں میں کاٹنے لگی۔ وہ سوچتی تھی کیسی جھوٹی محبت تھی اُن کی۔ وہ تو میرے آنسوؤں کو دیکھ کر خود رو دیتے تھے۔ ذرا بے قرار ہوتی تھی تو آپ بے چین ہو جاتے تھے۔ کیا مردوں کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے؟ نہیں اَور مرد ایسے ہونگے وہ تو ایسے نہ تھے

خدا جانے کیا افتاد پڑی ہو" اس کی تکلیف کے تصوّر سے وہ پہروں رویا کرتی پھر بھی چین نہ آتا۔ اس نے ایک دن سوچا کہ یہاں کیا تخت پر بیٹھی ہوں۔ جہاں ہونگی چکّی پیس کھاؤں گی۔ اگر وہ نہیں آتے میں خود چلی جاؤں۔ چنانچہ وہ حیا کی چادر اوڑھ ہمت کے ہتھیار سج کر چل کھڑی ہوئی۔ مصیبت کے پہاڑوں کو پھاندتی تکلیفوں کے دریا چیرتی اس شہر میں آگئی جہاں اس کا سرتاج غیروں کی آغوشِ الفت میں بے خبر پڑا تھا۔

سب سے پہلے اُس نے دردِ محبت سے بے تاب ہو کر اثر میں ڈوبا ہوا خط لکھا۔

پریتم!

تیری یاد میں چکّی پیستے صُبح ہو جاتی ہے میں سمجھتی ہوں کہ تم آگئے۔ تب ہی آنگن بھر میں نُور پھیلا ہوا ہے چکّی چھوڑ کر میں تیرے پاؤں کی آہٹ پر کان لگا دیتی ہوں۔ نظریں دروازے پر استقبال کے لئے جاتی ہیں اور وہیں رُکی رہتی ہیں۔ اور میں بیٹھی دیوی دیوتا مناتی ہوں۔

جب تم نہیں آتے پریتم تو آرزوئیں خون ہو جاتی ہیں۔ آنکھیں حسرت کے آنسو روتی ہیں۔ سرِ شام کھاٹ پر لیٹ کر تارے گنتی

ہُوں اور کبھی پوچھتی ہُوں کہ خوبصورت ستارو! اُونچے سے دیکھ کر دُور تک نظر کر کے بتاؤ کہ کہیں وہ آتے تو نہیں۔

جب چاند چڑھتا ہے تمہارے چہرے کی جھلک معلوم ہوتا ہے، میں اس کو دیکھتی رہتی ہُوں کہ اچھّے بھاگ ہوتے تو وہ چندرماں کی روشنی میں چل کر آجاتے۔ پھر تم نہیں آتے اور مَیں یُوں ہی برہ کی آگ میں جلتی رہتی ہُوں۔

کبھی کالی رات ڈائن کی طرح بال کھولے کھڑی ہو جاتی ہے مَیں اندر آنگن اس خیال سے بیتاب ہوتی ہُوں کہیں میری محبت میں تم ایسے وقت نہ چل دو۔ دن میں جب چکّی پیستے تھک جاتی ہُوں تو کاگ اڑاتی ہُوں کہ تمہارے آنے کی کوئی خبر لائے۔

مَیں انتظار کرتے کرتے تھک جاتی ہُوں پر پریتم تم نہیں آتے۔ تم ناراض ہو گئے ہو۔ تم تو کبھی ناراض نہ ہوتے تھے۔ کسی بیرن نے میرا پریتم مُجھ سے چھین لیا۔ مَیں سنتی ہُوں شہروں میں چھنالیں بال کی گرہ میں مَردوں کے دل باندھ لیتی ہیں۔ اگر ایسا ہے، تو میرا تاج و تخت آج لٹ گیا۔ جب تم ہی غیر کے ہو گئے تو اب میرا دنیا میں کیا رہا۔ لیکن مجھے اس بات کا یقین نہیں پڑتا۔ پھر کیا سمجھوں کہ مَیں موہن کے مَن سے کیونکر بسر گئی۔

خط کو خونِ جگر سے لکھا اور تہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔ دُور سے آئے ہُوئے درماندہ مسافر کی وضع اختیار کر کے حسن کے بازار میں گئی اور کھویا ہوا موتی عشوہ فروشوں کی دوکانوں سے تلاش کرنے لگی۔ ایک جگہ دیکھا کہ محبوب ایک مطلوب کو پہلو کی زینت بنائے بیٹھا ہے۔ دنیا اندھیر ہو گئی آنکھوں کے سامنے ترمرے اُڑنے لگے۔ دیوار کا سہارا لیکر وہیں کھڑی ہو گئی۔ اس پراگندہ حال نووارد کو دیکھ کر ان کی خوشیوں کی جنت میں سانپ کا سایہ پڑ گیا۔ دونوں نے چونّی پھینک کر آواز دی۔ "جاؤ بھکاری"

"بھکاری" اس جگر پاش نظارے سے چوٹ کھا کر لوٹا۔ گرانباریٔ غم سے آہستہ آہستہ چلا اور بازار میں آکر کھڑا ہو گیا۔ دیر کے بعد امیر زادہ کسی ضرورت کے لئے بازار میں نکلا تو بھکاری نے جیب سے خط نکال کر اس کے حوالہ کیا۔ امیر زادہ نے ایک دوکان میں جا کر شمع کی روشنی میں خط کو پڑھا اور اس کا رنگ رُو متغیر ہو گیا۔ خط احتیاط سے جیب میں رکھ کر آہِ سرد بھری اور آہِ سرد بھر کر واپس لوٹ گیا۔ اگرچہ خط لانے والے کی اُس نے بات تک نہ پُوچھی تاہم آج کی کارروائی سے بھکارن مطمئن تھی۔ کیونکہ آہ سرد محبت کی یاد کا بہترین ثبوت ہے۔

ایک دن وہ خوبرو لڑکے کی شکل بدل کر ایک ہاتھ میں ساز دُوسرے میں مضراب پہن کر حُسن کے بازار میں عشق کے راگ گاتی آتی۔ آخر شباب میں بھی لوگوں کے دلوں میں محبت کی آگ بھڑک اُٹھی خوبروئی نے خوش گلوئی سے مل کر قیامتیں بپا کر دیں۔ محبت کا غدّار اور پریم کی چور یعنی پریتم اور وہ پری دونوں ستار کے نغموں اور راگ کی محویّت میں باہر نکل آئے۔ ہزار منت کر کے بڑے ادب سے اندر لے گئے اور مطرب دلنواز نے ساز کو سیدھا کر کے اس سوز سے محبت کا میٹھا راگ گایا کہ دونوں جھوم کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ نوجوان مطرب کو گھر میں مقیم ہونے کی دعوت دی اور اس پہ جان چھڑکنے لگی۔ بیسوا کا عشق ہوا کی طرح رخ بدلتا رہتا ہے مطرب خوش جمال کی زلفِ گرہ گیر میں پھنس کر اپنی کنگھی چوٹی بھولی اور اس کے پریتم کو بھی پریم کی بھولی ہوئی کہانیاں یاد آگئیں۔ دو دن میں دونوں کا توڑ جھوڑا ہوگیا۔ بیوی کی پاک محبت خوشگوار خواب کی طرح تازہ ہوگئی۔ آخر وہ بیسوا کی بے وفائیوں سے آزردہ خاطر ہو کر وفا کی دیوی بیوی کے درشن کو چل دیا۔

راج بیٹی کا جب تریا چلتر چل گیا تو وہ بھاگ دوڑ کر خاوند سے پہلے اسی گاؤں میں آگئی جہاں پریتم اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

خاوند نے آکر جب بیوی کا اصل حال دیکھا تو اپنے رنگین مشاغل پر بہت افسوس ہوُا۔ نازوں پلی پھولوں میں کھیلی عورت جب چکی پیس کر گذر اوقات کرنے پر آجائے تو سینہ کیوں شق نہ ہو جائے۔ اپنی ناتمام مساعی کا ذکر کر کے ندامت کے آنسو آنکھوں میں بھر لایا۔

عورت خاوند کے اقبال کے وقت تنک مزاجی کر گذرتی ہے۔ لیکن ادبار کے وقت ہمہ تن وزرا اور بہترین راہنما ہوتی ہے۔ اطمینان سے بولی جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔ جب مقصد لیکر اُٹھے تو چاہیئے کہ انسان دوسری دلچسپیوں میں پڑنے سے احتیاط برتے۔ تاہم آپنے فطرتِ انسانی کا تجربہ کر لیا ہے۔ اسی تجربہ کو راہنما بنائیے اور بجائے دیارِ غیر میں جا کر غنیم چڑھا لانے کے اسی جگہ لوگوں کو ان کی سربلندی کا یقین دلائیے اور غریبوں کو انقلابِ حال کی دعوت دیجئے۔ میرے خیال میں یہ غلطی تھی کہ بھوکوں کی فوج کسی دوسرے مقام پر تیار کی جائے اور حملہ یہاں کیا جائے۔ کیا میرے باپ کے ملک کی حالت دگرگوں نہیں ہو گئی۔ گھروں میں خوشحالی کا نام نہیں۔ وہ بہتر زندگی بسر کرنے کے لئے موت قبول کرنے کو تیار ہیں۔ انہیں کوئی بہادر رہنما چاہیئے۔ اگر انہیں ایسا شخص میسر آجائے تو وہ جان پر کھیل جانے کو تیار ہیں۔ دُنیا ہر وقت انقلاب کی متمنی ہے۔ لیکن انقلابی لیڈر نہیں

ملتے۔ عزم سے عاری نوجوان مقصد بلند کو حاصل نہیں کر سکتے۔ آپ میری طرح مزدور کے لباس میں غریبوں کی رہنمائی کریں۔ فاقوں سے تنگ آئی ہوئی آبادی کو اس کی مفلسی کا احساس دلائیں۔ رعایا کے اس حال پر بے پناہ احکام کے خلاف ایک جتھا تیار کر کے قلعے کو ہمت سے سر کر لیں۔

چنانچہ پرتیم مخلص مفلسوں کی تلاش میں لگ گیا اور مزدوروں کو منظم کر کے ایسی طاقت حاصل کر لی کہ قلعہ کا امیر اور اس کے سردار غریبوں کی بے پناہ فوج کے سامنے بے بس ہو گئے۔ انہوں نے شبخون مارا تھا۔ انہوں نے دن کے وقت بغیر ایک قطرہ خون گرائے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ نشۂ امارت سے چور اور مے سے مخمور سردار جو غریبوں کے خون کو شراب ارغواں سمجھ کر پی جاتے تھے گرفتار ہو گئے۔

بھوکوں کا لیڈر جب قوم کا سردار قرار پایا تو راج بیٹی نے کہا پرتیم حکومت کا حصول آسان لیکن حکومت کرنا مشکل ہے۔ ملک میں انصاف جاری کرو۔ کسی وقت غافل نہ بیٹھو۔ ملک میں جائز شکایت نہ پیدا ہونے دو۔ مبادا کوئی اور لوگوں کے احساس سے فائدہ اُٹھا کر وہ صورت حال پیدا کر دے جو ہمارے لئے خوش آئند نہ ہو۔ احتیاط رکھو کہ راج میں بھوک اور فاقہ کے باعث کوئی ناراض نہ ہو۔

پریتم ہمیشہ راج بیٹی کے نصائح اور ہمت افزائی کا مشکور رہتا تھا۔ لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ اسے رنگ رلیوں سے نجات دلانے والا کون تھا۔ ایک دن وہ قلعہ کے باغ میں پھول کی کیاریوں کو دیکھ رہا تھا۔ خوشنما گل بوٹوں پر خوبصورت تبتری رنگین پر پھیلائے اور بھی سماں باندھ رہی تھی۔ کوئی قلعہ کے باہر سریلی آواز میں محبت کے گیت گاتا سنائی دیا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ یہ آواز اور یہ راگ تو پہلے سُنا ہے۔ کیا وہ خوش جمال مطرب یہاں آگیا جس نے ببیوا کے گھر ناگ سے میرے رنگ کو بھنگ کر دیا تھا۔ اتنے میں اُس نے دیکھا کہ وہی کاکل دراز مطرب مضراب سے تار ہلاتا اور لہرا لہرا کر گاتا چلا آرہا ہے۔ وہ آتے آتے مودّب فاصلہ پر آکر رُک گیا۔ پریتم نے پہلے تو رقابت کے احساس سے پیچ سا کھایا۔ لیکن فوراً ہی خیال گذرا کہ یہی تو میرا حقیقی نجات دہندہ ہے۔ خوش ہو کر کہا ہاں مطرب سنائے جا۔

مطرب نے گھبرا کر کہا سناؤں تو ضرور مگر ذرا دیکھئے۔ پریتم حیران ہو کر دیکھنے کے لئے پلٹا۔ مطرب نے کوٹ کھولا۔ سر سے پگڑی اتار کر بالوں کو شانے پر گرا کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے غسل خانہ سے ابھی نہا نکھر کر ہوا میں بال سکھانے کھڑی ہے۔

پریتم نے کچھ نہ پا کر بات کر کہا کچھ بھی نہیں مطرب!

خوبصورت مطرب حسین مطربہ بنی کھڑی تھی آنکھوں سے پریم رس ٹپک رہا تھا۔

فرقہ وار فساد

محسن نے خوب کہا اور کچھ دیر کے بعد سو گیا۔ صبح اٹھا تو دہلی کے اخبار بیچنے والے لونڈے ہوٹل میں آئے اور بمبئی میں خوفناک فساد کی صدا دی۔ حسب معمول کمرہ میں پھرے۔ محسن نے اخبار خرید کر پڑھا۔ اول صفحہ پر یہ موٹی سرخیاں تھیں۔

بمبئی میں ہندو مسلم فساد

بڑے بڑے بازار خونریزیوں کا مرکز بن گئے۔

بمبئی کی مشہور حسینہ اندرا فساد فرو کرتی سخت مجروح ہو گئی۔

مسجد کے ساتھ مندر کی تعمیر کا کام آج شروع کر دیا گیا۔ یہ تعمیر ہندو مسلم نزاع کے اندیشہ سے رکی ہوئی تھی۔ جس اندیشہ کا شبہ تھا آج حقیقی ثابت ہوا۔ صبح سے ہندو مسلمانوں میں فساد شروع ہے۔ تمام بازار بند ہیں۔ ہندو مسلمان الگ الگ گروہوں میں خشت باری کر رہے ہیں۔ محلوں میں اکّے دکّے پر چاقوؤں سے حملے ہو رہے ہیں۔ اس وقت پچاس آدمی اور ۴ بچّے مارے جا چکے ہیں۔

ایک بازار میں ہندو مسلمان دو رویہ کھڑے ایک دوسرے کو سنگسار کر رہے تھے۔ بمبئی کی مشہور حسینہ اندرما ہجوم کے درمیان ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئی۔ مشتعل ہجوم برابر خشت باری کرتا رہا۔ اندرما باوجود زخمی ہونے کے کچھ دیر یوں ہی ہاتھ باندھے کھڑی رہی۔ آخر ایک بڑے پتھر کی چوٹ سے لوٹنی کھا کر زمین پر گری۔ جب تک ہوش اور سکت رہی وہ زمین گری بھی ہاتھ باندھ کر اونچے کئے رہی۔ جونہی وہ بے ہوش ہوئی۔ ہجوم کو دیوانگی سے ہوش آیا اور وہ خشت باری سے رک گیا۔ اتنے میں ایمبولینس کار پہنچ گئی وہ زخمیوں کو اٹھا کر لے گئی۔

بعد کی خبر۔ بمبئی کی ہر گلی اور کوچہ معرکۂ کارزار کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ فوج کا پہرہ لگایا جا رہا ہے۔ کانگرسی کارکن فساد فرو کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں لیکن فرقہ پرست لیڈر اندر ہی اندر فساد کی آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔ اس وقت تک ۔ ۷ کے قریب آدمی مر چکے ہیں لیکن حالات قابو میں ہیں۔ کمشنر پولیس فساد زدہ رقبے کا معائنہ کر رہے ہیں مزید فوج منگوائی جا رہی ہے۔ کوشش ہو رہی ہے کہ فساد بڑھنے نہ پائے۔

آخری تار۔ باوجود پولیس اور فوج کی آمد کے فساد بڑھ رہا ہے۔ زخمیوں

میں دو عورتوں کا اور اضافہ ہو گیا ہے لیکن حالات قابو میں ہیں۔ ۴ مجروح ہسپتال میں پہنچ کر مر گئے۔ ۱۵ آدمیوں کی حالت نازک ہے، اندرما ابھی بے ہوش ہے۔ ڈاکٹر زندگی کی زیادہ امید نہیں دلاتے اس کے متعلق سرکاری اور غیر سرکاری حلقے از راہِ ہمدردی ہسپتال سے دریافت حال کر رہے ہیں۔

محسن نے اس خبر سے متوحش ہو کر فرحت کو پکارا۔ وہ فوراً اندر آیا محسن نے کہا کچھ سُنا۔ لو پڑھو اندرما سخت زخمی ہو گئی اور اسکی حالت نازک ہے۔ فرحت نے اس خبرِ وحشت اثر کو پڑھا اور محسن کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر فرطِ غم سے آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور کہا کہ

"میں تو اندرما کو مغرب زدہ لاابالی لڑکی سمجھتا رہا۔ اہلِ ملک سے یہ محبت قابلِ ستائش ہے۔"

محسن۔ تو بمبئی نہیں چلتے فرحت؟ وہ تمہیں دیکھ کر ضرور خوش ہو گی۔

فرحت۔ میں نہیں سمجھا کہ مجھے دیکھ کر خاص طور پر کیوں خوش ہو گی۔

محسن۔ فرحت اسے تمہارے ساتھ الفت ہے۔ تم جانو نہ جانو مگر میں جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ اسے گہری دل بستگی ہے۔

فرحت۔ آقا کو چھوڑ کر ملازم سے کون دل بستگی پیدا کرے گا۔ پھر وہ جو دولتِ دنیا سے بے نیاز ہے۔

محسن۔ دولتِ دنیا سے بے نیازی ہی بعض اوقات بندہ نوازی کا باعث ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک بات اور سنو میں نے تمہیں دوست بنا کر رکھا ہے لیکن تم مجھے آقا کہہ کر مخاطب کرتے ہو۔ میرے لئے تمہارا طرزِ عمل سخت صدمہ کا باعث ہو رہا ہے۔ تم میرے ساتھ بمبئی چلو مگر یہ بات یاد رکھو کہ محسن فرحت کا دوست ہے

بمبئی چلنے پر محسن کو اصرار تھا۔ اس اصرار پر فرحت انکار کیوں کرتا تیار ہو گیا۔ دونوں دوست دہلی سے چل کر بمبئی پہنچے۔ پولیس کی حفاظت میں سرکاری ہسپتال کے قریب ہوٹل میں پہنچا دیئے گئے۔ ہوٹل میں اسباب رکھ کر وہ ہسپتال گئے۔ زخمیوں اور سپیشل وارڈ میں جا کر دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اندرا کو اب افاقہ ہے لیکن زخموں سے ابھی نڈھال ہے۔ محسن نرس سے اجازت لیکر پہلے کمرہ میں داخل ہوا محسن کو دیکھ کر اندرا کے چہرے پر رونق آگئی۔ تاہم فوراً دریافت کیا کہ فرحت نہیں آیا کیا؟ محسن نے کہا وہ نرس سے باتیں کر رہا ہے اتنے میں نرس اور فرحت دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ اندرا کا چہرہ باوجود زخموں کی تکلیف کے پھول کی طرح شگفتہ ہو گیا۔ نرس نے فرحت اور اندرا کو اطمینان کی نظر سے دیکھا محسن کو باتوں میں لگا کر باہر لے آئی۔ تاکہ فرحت اور اندرا کو تنہائی کا موقعہ ملے۔

"تم آ گئے فرحت"۔ اندرما نے آہستہ سے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔
"مجھے معاف کر دو اندرما، مَیں نے تمہاری بلندیٔ اخلاق کے متعلق بڑا غلط اندازہ لگایا تھا۔

"اور اب صحیح صُورت کیا معلوم ہوئی ہے"۔ اندرما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

فرحت۔ اب میری نظر میں تم وہ دیوی ہو جو نیکی کو چھپاتی ہے اور جہان کی نظر میں لااُبالی اور ناکارہ ظاہر ہونے کی کوشش کرتی ہے۔

اندرما۔ تمہاری زبان سے یہ بات سُن کر مجھے خوشی ہُوئی ہے۔ میری تکلیف کا تمہیں کہاں اور کیسے معلوم ہُوا۔

فرحت۔ ملک کے اخباروں میں بمبئی کے فسادات کی دہائی مچی ہے۔ تمہارا کارنامہ ہر زبان کا مقبول افسانہ ہے۔ ہاں بتاؤ اب طبیعت کا کیا حال ہے۔

اندرما۔ مَیں اب اچھی ہوں فرحت۔

لیکن اتنی ہی گفتگو میں اندرما کو کچھ نقاہت سی معلوم ہوئی۔ فرحت مزید گفتگو مناسب نہ سمجھ کر خاموش پاس بیٹھ گیا۔ اندرما نے بھی کمزوری کے باعث آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد اندرما نے آنکھیں کھولیں۔ وہ محبت کی نظر سے

فرحت کو دیکھتی رہی۔ فرحت دردمند تیماردار کی طرح اُسے دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔ اتنے میں نرس اور محسن اندر آئے۔ محسن نے کہا اندرہا فرحت باوجود کم عمر ہونے کے بڑا سخنہ کار ہے۔ داستان گوئی میں اسے کمال حاصل ہے مَیں سفارش کرونگا کہ فرحت ہر رات کوئی عمدہ افسانہ سنائے جو تفننِ طبع کا باعث ہو۔ نیک دل نرس نے کہا کیا بیمار کے لئے آپ اتنی خدمت انجام نہ دے سکیں گے۔ فرحت نے جواب دیا زبانی جمع خرچ تو کیا جان جوکھوں میں ڈال کر بھی کوئی خدمت انجام دے سکوں تو دریغ نہ ہوگا۔ چنانچہ کبھی کبھی شام کے بعد فرحت اس خوش گوار فرض کو ادا کرنے کا وعدہ کرکے محسن کے ہمراہ ہوٹل میں آگیا۔

شہر میں شورش جاری تھی۔ شیطان علانیہ انسان کا خون بہانے پر لوگوں کو ابھار رہا تھا۔ تہذیب شرم سے سر جھکائے کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔ رحم سرپیٹ کر آبادی سے باہر نکل گیا تھا۔ معصوم بچّوں کا قتل کیسا ہولناک فعل ہے۔ آج مذہب کے نام پر یہ سب ظلم روا تھا۔ ہسپتال زخمیوں سے بھر چکا تھا۔ مریضوں کے خیمے باہر لگائے گئے تھے۔ سہاگ لٹ رہے تھے اور بچے یتیم ہو رہے تھے۔ فرشتۂ اجل رات دن مصروف تھا۔ شہر کے گلی کوچوں سے صدائے آہ وفغاں بلند ہو

رہی تھی۔ ایسے بھی تھے جو فانوں کے کارناموں کو فخریہ بیان کرتے تھے۔ محسن اور فرحت دن بھر ان خبروں پر اظہارِ تاسّف کرتے رہے دن میں ایک دفعہ دونوں اندرما کو دیکھنے آتے۔ پہلے سے وہ آج بہتر تھی۔ اندرما نے سنبھل کر کہا آج کوئی کہانی سنائیے گا فرحت؟ فرحت نے کہا پسندِ خاطر ہو نہ ہو مگر وعدہ پورا کرنے شام کو ضرور آؤں گا۔ یہ امید دلا کر دونوں چلے آتے۔ جب شام ہوئی تو فرحت نرس سے اجازت لیکر اندرما کے پلنگ کے پاس آرام کرسی بچھا کر بیٹھ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو محبّت اور پیار سے دیکھا۔ اندرما کی نگاہیں کہانی کے لئے ملتجی تھیں۔ فرحت نے یوں حکایت بیان کی۔

بوٹی نوشش

طوفانِ نوح سے پہلے مریخ اور اس دنیا کے لوگوں میں نامہ و پیام تھا۔ اہلِ دنیا کو وہاں کے تاریخی حالات اسی طرح معلوم تھے جس طرح ہمیں اب امریکہ کے حالات کا علم ہے۔ مریخ کی طویل و عریض دنیا میں ایک بڑی سلطنت لوبیا کے نام سے مشہور تھی جس میں صدیوں سے امن و امان قائم تھا۔ اس کے ہمسایہ میں دوسری سلطنت حمین کے نام سے موسوم تھی۔ جس کا بادشاہ صاحبِ عزم تھا۔ اس صاحبِ عزم

بادشاہ نے لوبیا کی سلطنت پر کئی بار حملہ کیا۔ مگر لوبیا کے بہادر سپاہیوں سے چمن کی فوجوں نے ہمیشہ منہ کی کھائی۔ چمن کے بادشاہ نے جب زندگی کے خوشنما خوابوں کو پریشان ہوتے دیکھا تو بڑا غمگین ہوا۔ چمن کے بادشاہ نے اپنے مشیروں کی رائے سے دربار عام کیا۔ ملک کے ایک مشہور حکیم نے خدا جانے بادشاہ کے کان میں آن کر کیا کہا شہنشاہ کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔ بادشاہ نے درباریوں کو انعام واکرام دے کر رخصت کیا۔ مگر حکیم کو شاہی محلات میں ٹھہرا لیا گیا۔

دوسرے روز بادشاہ نے حکیم کو اپنی خلوت میں طلب کر کے پوچھا کہ اے حکیم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میرے حریف کے ملک کے لوگ توانا اور قوی ہیں۔ اُن کے مضبوط قویٰ ہی ان کی فتح کے ضامن ہیں لیکن اس بُوٹی کا رواج ان میں کیونکر پائے۔ اگر یہ بُوٹی نشہ آور دوائی ہے تو وہاں کا والی اس کی ممانعت کر دے گا کیونکہ ملکی قانون منشیات کے استعمال کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ حکیم نے عرض کی یہ بوٹی نہ بالکل مہلک ہے نہ پوری منشّی۔ اس لئے سب سے پہلے علما اور صوفیا میں اس کو رواج دینا ہماری اس مشکل کا حل ہے۔ تاکہ یہ گروہ اپنے تجربہ کی بنا پر اس کے بے ضرر ہونے کی شہادت دے سکیں۔ اسطرح حکومت مجبور ہو جائے اور عوام میں یہ بُوٹی رواج پا جائے۔ اس بوٹی کے خواص

کے متعلق میں شہنشاہ کو اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ یہ قوائے کو کمزور کر کے عمل کی قوت کو بتدریج سلب کر لیتی ہے۔ ہاں دوسروں کے اخلاق برباد کرنے کے لئے کچھ اپنے اخلاق کی قربانی بھی کرنا پڑے گی آپ اتنا انتظام فرمائیں کہ ملک کی آبرو باختہ عورتوں کی ایک جماعت تیار کریں جو میری زیر ہدایت اس بوٹی کا استعمال سیکھیں اور سلطنت کے خرچ پر حریف کے ملک میں جائیں اور شریفانہ زندگی کی ابتدا کر کے بالآخر اپنے دامِ فریب میں وہاں کے علما صوفیا اور امرا کو پھانسیں ان سے جائز یا ناجائز تعلقات پیدا کر کے اس بوٹی کا رواج دیں۔

بادشاہ کچھ دیر سوچ کے بعد بولا کہ یہ بات کچھ مشکل نہیں۔

چمن کی خوبصورت عورتوں نے لوبیا کے خوشنما شہروں میں ٹھاٹھ سے رہنا شروع کیا۔ وہ مسندِ زرّیں پر بیٹھ کر چاندی کی چلموں میں بوٹی کو کوئلوں پر داغ کر دھواں اُڑانے لگیں۔ امرا علماء صوفیا کے اوقات فارغ ہوتے ہیں۔ وہ یوں بھی اپنی وسیع فرصتوں میں کوئی نہ کوئی مشغلہ تلاش کرتے ہیں۔ اس بوٹی کے مشاغل میں پڑ گئے۔ آوارہ مزاج امرانے حسن کو پیسے خرچ کر کے خریدا۔ صوفیائے تقدس بیچ کر انہیں اپنے حلقے میں شامل کیا۔ مذہب فروش علما نے ان عصمت فروش

عورتوں کو مالِ غنیمت سمجھ کر گھر ڈال لیا۔ سلطنت چمن کی آبرو باختہ حسین جاسوسوں نے ملک میں اِس جڑی بوٹی کا ایسا رواج دیا کہ ملک کی حجاب مآب بہو بیٹیاں بھی اس نامراد بوٹی پر عاشق ہو گئیں۔ یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی اسی بوٹی کے استعمال کے عادی ہو گئے۔

لوبیا کے گھر جو صفائی کے لحاظ سے بہشت کا نمونہ معلوم ہوتے تھے اب وہاں جگہ جگہ کوئلے اور راکھ پڑی تھی۔ شہر اور بستیاں جو شیشے کی طرح صاف تھیں۔ اب لوگوں کی کمی ہمّت کا نوحہ کرتے تھے اور گلی کوچے صفائی سے محروم تھے کھیتوں میں جہاں فصلیں لہلہاتی تھیں۔ وہاں جھاڑ کانٹے اُگے ہوئے تھے۔ لوگ ایک گھنٹہ کھیتوں پر محنت کرتے تھے تو دو گھنٹے جڑی بُوٹی پینے میں صرف کرتے تھے۔ جہاں کوئی ایک پینے بیٹھتا وہاں پچاس کسان اور جمع ہو جاتے۔ ایسے لوگ کھیتی کیا کر سکتے ہیں۔ اگر کرتے تھے تو یہی بوٹی کاشت کرتے تھے اور گوداموں کو بھر لیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک سے برکت اُٹھ گئی اور ادبار چھا گیا۔ بادشاہ نے بڑی کوشش کی یہ عادت چُھٹ جائے۔ لیکن علما صوفیا امرا آڑے آئے کہ یہ لوگوں کے جائز مشاغل ہیں ناجائز مداخلت ہے۔ یہ نشہ نہیں اس میں بے ہوشی کا جزو نہیں اس لئے حرام نہیں۔

بادشاہ رائے عامہ سے مجبور ہوگیا۔ اہلِ ملک کی صحت پر تباہ کن اثر دیکھ کر اُسے پھر خوف ہؤا کہ ہتھیار اُٹھانے کی قابلیت ملک سے ختم ہو رہی ہے چاہا کہ فوج میں اس کی ممانعت ہو جائے لیکن وہاں فوجی افسروں نے نہ مانا۔ غرض چند سالوں میں ہتھیار سج کر نکلنے والے نوجوان اس بوٹی کے پینے کے آلات اُٹھائے پھرنے لگے۔ ان کے چہرے کی سُرخی زردی سے بدل گئی۔ اور جس کام میں وہ ہاتھ ڈالتے اُس کو ادھورا چھوڑ کر اُٹھتے۔

اِدھر لوبیا کے لوگوں کی یہ کیفیت تھی اُدھر چمن کے بادشاہ نے عورتوں تک میں کھلی ہوا میں مردانہ ورزشوں کو رواج دیا۔ تربیتِ اطفال کے مرکز کھولے۔ نوجوانوں میں فوجی روح پیدا کرنے اور مضبوط جسم بنانے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ کون نہیں جانتا کہ عام طور پر مضبوط جسم میں بہادر دل ہوتا ہے۔ اب چمن کے لوگ بادشاہ کو بے ضرورت امن پسندی کا طعنہ دینے لگے کیونکہ ان کی جوانی کا جوش گھروں کی نسبت اب میدانِ کارزار کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ بادشاہ خود اس موقعہ کا منتظر تھا اُس نے بھی عام فوجی تیاری کا حکم دیا۔ اعلانِ جنگ کی خبر عام ہوئی تو چمن کے نونہال ہتھیاروں کو جسم پر سج کر گھروں سے نکلے اور لوبیا کے لوگوں کو علم ہؤا تو اپنے آلات پر بیٹھ کر کش لگانے لگے۔

اور دھوئیں سے ہوا میں قلعے بنا بنا کر خوش ہونے لگے کہ چمن کے لوگوں نے ہزار بار چڑھائی کی۔ ہزار بار منہ کی کھائی۔ میاں اس ملک پر پیروں فقیروں کی برکت ہے۔ اب کے ایسے ٹپکیں گے کہ سالے سالوں تک یاد کریں گے۔

غرض دونوں ملکوں کے بہادر آمنے سامنے ہوئے۔ اہلِ چمن مونچھوں پر تاؤ دیتے آئے یہ کھا نستے بڑھے۔ قبل اس کے کہ طبلِ جنگ پر چوٹ پڑتی۔ شاہِ چمن کے حضور میں وہی حکیم حاضر ہوا اور کہا سرکار اب لڑائی کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اسی جگہ خندقیں کھود کر قیام کریں اور جانباز جاسوسوں کی معرفت لوبیا کے ان گوداموں کو آگ لگوا دیں جس میں یہ بوٹی پڑی ہے اگر یہ تجویز کامیاب ہوگئی تو ہتھیار اُٹھانے کی نوبت نہ آئے گی۔ اور لوبیا کے لوگ خود ہتھیار ڈال کر لیٹ جائینگے یہ لوگ اپنی عادت کے باعث مر چکے ہیں۔ مرے کو مارنا مناسب نہیں۔ کھلے شہروں میں آگ لگانا کتنا آسان تھا۔ جاسوسوں نے بُوٹی کے ہر گودام کو دیا سلائی دکھائی آگ آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ ان گوداموں کا جلنا تھا کہ ساری آبادی پر اوس پڑ گئی۔ اور ان کے سارے ولولے سرد ہو گئے۔ لوبیا کے فوجی جب بُوٹی کے کش سے محروم ہو گئے تو ان کی جان پر آبنی۔ چہروں پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔

منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ پیٹ اپھر گیا تھا۔ وہ ہتھیار کیا اُٹھاتے ان کی جان چھوٹ رہی تھی اور وہ بے تابی میں زمین پر لوٹ رہے تھے۔ ایسی حالت میں چمن کی فوج خندقوں سے نکلی۔ بغیر کسی شدید مقابلہ کے ملک پر فتح حاصل کر لی۔

اندرما نے یہ سمجھ کر کہ شاید کہانی ختم ہو گئی ہے کہا "تم شمالی ہند میں بھی گئے ہو فرحت! وہاں پچھلے سال میں نے جا کر دیکھا کہ بعض قومیں حقّہ نوشی کے باعث باوجود عمدہ قویٰ کے مضمحل اور ناکارہ سی ہو رہی ہیں۔

فرحت۔ مَیں ابھی بات ختم نہیں کر چکا۔ اندرما خاموش ہو گئی۔

ہتھیار جب رکھ دیئے جائیں ان کا اٹھانا مشکل ہے۔ قومیں جب مغلوب ہو جائیں اُن کا غالب آنا آسان نہیں ہوتا۔ شکست کھا کر لوبیا کے نوجوانوں کی آنکھیں کھلیں۔ انہیں موت میں زندگی سے زیادہ کشش نظر آنے لگی۔ انہوں نے آزادی کے لئے آخری ہاتھ پاؤں مارے مگر ملک میں قومی اخلاق فنا ہو چکا۔ چمن کے زیرک بادشاہ نے لوبیا کے لوگوں کو لالچ دے کر اُنہیں کے ہاتھوں آزادی خواہ نوجوانوں کا خاتمہ کرا دیا۔ غلامی کے بعد آزادی کی اس ناکام جدوجہد نے ملک پر اور بھی موت طاری کر دی۔ آبادی کا بڑا حصہ غلامی پر قانع ہو گیا۔ فاتحین

نے کمال دانائی سے ملک میں ایسے مذہبی اور اقتصادی جھگڑے
کھڑے کر دیئے جس سے ملک لوبیا کی آبادی مختلف گروہوں میں تقسیم
ہوگئی۔ امرا اور صوفیا نے اپنی قسمت صاف طور پر غیر ملکی حکام سے وابستہ
کرلی۔ مذہب اور دولت دونوں ان کی خوشنودی کے لئے استعمال
ہونے لگے۔ غربا کا کچومر نکل گیا مفلسی کے باعث خودکشی کی وارداتیں
بڑھ گئیں۔ غریب عوام کی حالت اس سرما دیدہ درخت کی سی ہوگئی جو
میدان میں بے برگ و بار ٹنڈ منڈ کھڑا ہو۔

یکبیک رحمتِ حق جوش میں آئی حسن آرا ایک غریب گھر میں
غنی مزاج لڑکی پیدا ہوئی مٹی میں کھیلی مصیبت میں پلی جوان ہو کر باغِ
ہستی کا بہترین پھول بن گئی۔ دولت کے نشّے میں چُور مغرور نوجوان
اس کے دل کو سونے کی جھلک سے مسخر کرنے کی غرض سے آئے۔
اس کے اخلاق کی بلندی اور اپنی پست فطرت کا موازنہ کرکے لوٹ گئے۔
دسترس سے دُور حسن کو شہرت کے چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ہر گوشۂ ملک
میں اس کی رعنائی اور زیبائی کی داستانیں زبان زدِ خلائق ہوئیں۔ خود
بھی کم حسین نہ تھی لیکن لوگوں کے حسن تخئیل نے اسے مرجع عالم بنا دیا۔
امیر حسن لوٹنے کیلئے۔ غریب حسن کی دیوی کو بھینٹ دینے کو آتے۔ اس
طرح اس کے در پر امیر اور غریب زائرین کا ہجوم رہتا۔ دنیا منتظر تھی

کہ یہ نُورِ محل بنتی ہے یا کسی جھونپڑے کی روشنی کا باعث ہوتی ہے۔

عورتوں کی دنیا میں یہ ہلچل تھی۔ مردوں میں بھی جانباز گدڑی کا لعل خاک مذلت سے اٹھا اور بامِ شہرت پر پہنچا۔ وہ صحت اور شرافت کا بہترین نمونہ تھا۔ رخساروں پر جوانی کا سرخ خون اور آنکھوں سے حیا ٹپکتی تھی۔ اسے اپنی غلام قوم کی حالتِ زار کا گہرا احساس تھا۔ اس نے دیار و امصار میں جاکر لوگوں کی رگِ حمیت کو بھڑکایا کہ غلامی کی زندگی سے موت بہتر ہے۔ تم اپنی اولاد کے لئے بہتر ورثہ چھوڑ جانے کے لئے فکرمند ہو لیکن غلامی کو ورثہ میں چھوڑ جانے سے بے پرواہ ہو۔ تم بوٹی کا کش لگا کر اس کے دھوئیں میں صحت اور قوتِ عمل کو ضائع کر رہے ہو حالانکہ یہ وقت فوجی قوت حاصل کرنے کے لئے صرف کرنا چاہئے تھا۔

آوارہ مزاج نَوجوانوں نے جانباز کی بات کو تعجب سے سنا اور غلامی پر قانع لوگوں نے اس کی طرف نفرت سے دیکھا۔ لیکن اُس نے انقلاب انگیز خیالات کی اشاعت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ لوگوں نے اس کے پیغامِ آزادی کو شوق سے سننا شروع کر دیا۔ اس کی زیرِ ہدایت فوجی رضاکار دل نے جتھے ترتیب دے کر ایک بڑی قوت پیدا کر لی۔ بوٹی نوشی کے خلاف ان تھک جہاد شروع ہو گیا۔ ایسی تباہ کن عادت رکھنے والے کو قوم کا سب سے بڑا غدّار سمجھا جانے لگا۔ اس نشہ کو چھوڑتے ہی

مردوں کی ہمت بڑھ گئی کیس اور کاہل نوجوانوں سے دور ہو گئی۔ گلی بازار صاف اور گھر بھر ستھرے نظر آنے لگے۔

ادھر بڑے بڑے امیر گھرانوں کی لڑکیاں حسن آرا کی سہیلیاں کہلانے پر فخر کرنے لگیں اور اس کو اپنے گھر بلانے میں عزّت محسوس کرتی تھیں وہ خود شرمگین نگاہ اور کم گو زبان رکھتی تھی۔ اس لئے کوئی زبان درازی کر سکے یہ نہ پوچھ سکتا تھا کہ اس کے حریم ناز میں کون نیاز مندی کا فخر حاصل کرے گا۔ ایک دن ایک دعوت پر جہاں ملک کی حسین دوشیزہ لڑکیاں جمع تھیں ایک بھولی بھالی اور لاابالی لڑکی نے الھڑپن سے پوچھا باجی کس شہزادے سے بیاہ کراؤ گی۔

شاہی شان کے وسیع کمرہ میں قندیلیں روشن تھیں۔ قدآدم آئینے دیواروں پر آویزاں تھے شمعیں روشن تھیں۔ تمام کمرہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا ساٹن کے پردوں سے شعاعیں چھن چھن کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور وہ حسن کا آفتاب معلوم ہوتی تھی۔ جب بھولے پن سے یہ سوال کیا گیا ساری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

اُس نے دلآویز تبسّم سے لڑکی کی طرف دیکھا اور اس محبت سے اپنی طرف کھینچا جس طرح بڑی بہنیں چھوٹی ہمشیرہ کو پیار سے کھینچ کر گلے لگا لیتی ہیں۔ اور اس کو مخاطب کر کے فی الحقیقت سب کو سنا کر کہا۔

"چھوٹی بہن سن اور تیری وساطت سے سب دنیا سنے کہ وطن عزیز کو غلام ہوئے مدت ہو چکی ہے۔ اس کی دولت کے وہ لوگ مالک ہیں جو ہم سے محض حاکمانہ سروکار رکھتے ہیں۔ جن نوجوانوں کے دل میں غیرت تھی وہ آزادی کی اول جنگ میں کام آ چکے ہیں۔ اب میرا ملک بے غیرت غلاموں کی منڈی ہے۔ میری فطرت آزاد زندگی کو غلام سے وابستہ کرنے کیلئے آمادہ نہیں۔ مادرِ وطن کی قابلِ فخر بیٹیو تم بھی سنو کہ تمہارے والدین بھی تمہاری شادی اُس سے کرنا پسند کریں گے جو تمہارا بوجھ اُٹھائیں لیکن جو ملک کا بوجھ نہ اُٹھا سکیں وہ کسی شریف لڑکی کی محبت کے لائق نہیں۔ آؤ ہم مل کر غیرتِ قومی کی بجھی ہوئی چنگاریوں کو نوجوانوں کے دل میں روشن کریں اور آزادی کی وہ آگ لگا دیں جو بجھائے نہ بجھے۔

اِن نازک دلوں کو جو تمہارے ریشم کے لباس میں چھپے ہوئے ہیں خوب مضبوط کرو اور ان شریفوں سے شادی پر اصرار کرو جن کے دل میں آزادی کی امنگ ہو۔ مَیں تمہیں گمراہی کا مشورہ نہیں دیتی۔ صرف یہ کہتی ہوں کہ ان ننگِ انسانیت لوگوں سے رسمِ نکاح سے مجتنب رہو جو غلامی پر قانع ہو گئے ہیں۔ چند روزہ دنیا میں اپنی مسرتوں کی بنیاد غلط جذبات پر نہ رکھو۔ ملک کی مصیبتوں کو دُور کرنے میں امداد کرو۔ قوم کو غلامی سے نجات دلانا وقت کی سب سے بڑی نیکی ہے۔ آؤ ہم سب نیک بنیں۔ صرف

ان نیکوں سے عقد باندھیں جو بوٹی سے پرہیز کریں اور آزادی کے حصول کا ذمہ اُٹھائیں"۔

اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ نرم دل اور پاک باطن لڑکیاں ایسکے جذبہ خلوص میں بہ گئیں۔ اور سب نے بلند آواز سے کہا کہ ہم تمہارے سامنے عہد کرتی ہیں کہ ہم وطن کے غداروں سے سروکار نہ رکھیں گی۔ یہ خبر پر پرواز پیدا کر کے طول و عرض ملک میں پھیل گئی۔ حسن و عشق کے افسانوں میں دلچسپی لینے والے نوجوان آزادئ وطن کی داستانوں کو شوق سے پڑھنے لگے۔ بہتر شوہر ثابت ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ ملک میں غلامی سے نفرت اور آزادی کا چرچا شروع ہو گیا کیونکہ عالی گھرانوں کی شریف لڑکیوں نے آزادئ وطن کی مساعی کو شرط نکاح قرار دیا۔ شدہ شدہ ہر نکاح نامہ پر آزادئ وطن کا حلف شرط اول قرار پایا۔ حکام نے اس تحریک کو نسوانی ادا اور چند آبرو باختہ لڑکیوں کا نرخِ حسن بالا کرنے کا ذریعہ سمجھا۔ لیکن یہ تحریک ایک دو سالوں میں قیامت بن گئی۔ عورتوں نے اس بوٹی سے کش لگانے والے رشتہ داروں تک سے گفتگو بند کر دی۔ ملک بھر کی کایا پلٹ ہو گئی۔ غلامی کا احساس جو جاتا رہا تھا اب دردِ جگر بن گیا۔

جب سارا ملک آمادۂ پیکار ہو جائے وہاں غیر ملکی حکومت کب تک رہ سکتی ہے۔ پہلے چمن کی فوج اور لوبیا کے رضاکاروں کی

بے قاعدہ جھڑپیں ہوئیں بالآخر باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ لوبیا کی عورتوں نے مردوں کا لباس پہن کر دادِ شجاعت دی۔ دوست دشمن گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے۔ لوبیا کی عورتوں نے زخموں کی مرہم پٹی کا انتظام اعلیٰ پیمانے پر کیا۔ یہ نوجوان سردار جانباز کئی دفعہ زخمی ہوا لیکن میدان چھوڑ کر نہ آیا۔ لوبیا والوں کی حرکت میں خدا نے برکت دی چمپن کی فوج کھیت رہی۔ لوبیا کے رضاکار فتح کے پھریرے اڑاتے گھروں کو لوٹے۔

فوج کی کامیاب واپسی پر مرد و زن نے شایان شان استقبال کیا۔ چھتوں اور کوٹھوں پر چڑھ کر پھولوں کی بارش کی۔ ملک کی فاتح فوجوں کا سردار جانباز سفید گھوڑے پر پورے ہتھیار سج کر جا رہا تھا۔ کون تھا جس کی نگاہ اس کے دیدار کے لئے بیتاب نہ تھی۔ حسن آرا اور جانباز میں گو کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی لیکن بمصداق

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

دونوں کی حسین شہرت نے ایک دوسرے کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ اہل ملک کی قرارداد کے مطابق روز مقررہ اور معین وقت پر جانباز کے سر کامیابی کا سہرا باندھے جانے کی رسم ادا ہونا تھی۔ دربارِ عام منعقد ہو چکا تھا

اہلِ ملک کی نگاہ میں حسن آرا ہی اس عزت کے قابل تھی کہ جانباز کے لئے پھولوں کا تحفہ پیش کرے۔

حسن آرا کنواری لڑکیوں کے جھرمٹ میں خراماں پھول مالا لئے آئی۔ اس وقت وہ خود دلہن کی طرح سجی اور پھولوں سے لدی جارہی تھی۔ فوجی وردی میں جانباز بھی شگفتہ پھول معلوم ہوتا تھا۔ حسن آرا نے خوشنما پھولوں کے ہار ملک کے نجات دہندہ کے سامنے پیش کئے چند سہیلیوں نے بے خبری میں جھٹ اسکے دامن کو جانباز کی تلوار سے باندھ دیا۔ جب وہ پھول پیش کرکے پیچھے ہٹنے لگی تو دامن کو تلوار کے قبضہ میں الجھا ہوا پاکر حیران ہوگئی۔ حسن آرا اور جانباز نے لڑکیوں کی اس دل پسند شرارت پر ایک دوسرے کو مسکراکر دیکھا۔ لڑکیوں نے جانباز پر پھول برسا کر کہا۔

"لڑ لگی کی لاج رکھو"

اندر ما کہانی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگی۔ فرحت رخصت لے کر چلا آیا۔

دوسرے دن فرحت پھر اندر ما کے محبوب مشغلے کے لئے حاضر ہو گیا اندر ما نے کہا فرحت مجھے تمہاری شب گذشتہ کی کہانی سے خیال پیدا ہوا کہ شمالی ہندوستان کی آزادی کے لئے اسلحہ اٹھانے والا ہاتھ

ہے اور آزادی کے بعد جیسے بیرونی حملہ آور کے لئے مضبوط دروازہ ہونا چاہیئے وہ تمام کے تمام حقّہ نوشی کرتے ہیں۔ اس کے خواص تمہاری بیان کردہ بُوٹی کے خواص سے ملتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ حقّہ نوشی کے باعث ہمارے ملک کے بہادر باشندوں کا وہ حال ہو جو لوپیا کے لوگوں کا ہُوا۔

"ہم کل کی کہانی پر بحث کیوں کریں۔ لو نئی کہانی سنو" فرحت نے کہا۔

خُدا فروش

مریخ کی دو اور حریف سلطنتوں یعنی کری اور کاک کا ذکر ہے کہ صدیوں دونوں میں دوستانہ معاہدات قائم رہے۔ وہ ہمیشہ سے ایک دوسرے کے امن کے ضامن تھے۔ مملکت کری کی شہزادی اس دنیا کی عورتوں پر حسن میں سبقت رکھتی تھی۔ کاک کا نوجوان بادشاہ جو ابھی سریر آرائے تخت ہُوا تھا اس سے شادی چاہتا تھا لیکن شہزادی اپنے ہی ملک کے ایک بانکے سردار کو دل دے بیٹھی تھی۔ کاک کے بادشاہ نے دوستی کی پرانی رسم کو توڑ کر کری کی شہزادی پر قابُو پانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ شہزادی کو اپنے ملک کی سیر کی دعوت دے کر نہایت تزک و حتشام کے ساتھ اسکے استقبال کا اعلان کیا۔ کری کا بادشاہ قدیم دوستی کی

بنا پر اس دعوت کو رد نہ کر سکا۔ شہزادی کو مقاصدِ سیاست کے زیر نظر اس ناخوشگوار سفر پر جانا ہی پڑا۔ میدان اور پہاڑ قلعے اور معابد دیکھ کر جب اُس نے لوٹنا چاہا تو بادشاہ نے بلبل کی طرح اسے قفس بند کر دیا۔ کرہی کے لوگوں کو جب معلوم ہوا تو ان کے سینوں میں غیرت نے آگ لگا دی۔ بادشاہ نے امیروں اور وزیروں سے مشورہ کیا۔ فوج کے سرداروں نے کہا کاک کی سلطنت پہاڑوں میں محفوظ ہے۔ اس پر کامیاب حملہ کے لئے ایک سال کی تیاری لازمی ہے۔ آج فوج کشی کر کے ان کے نقصان کے بجائے اپنا نقصان ہے۔

کاک کا بادشاہ بھی اپنی تدبیروں سے غافل نہ تھا لیکن حسن اکثر سلطنتوں اور خاندانوں کے لئے منحوس ثابت ہوا ہے۔ کاک کے بادشاہ کی عیش پسند طبیعت عواقب سے خائف بھی تھی تاہم حسن پرستی نے اسے عیش پسند بنا دیا تھا اور عیش پسندی نے بزدل۔ یہ بزدلی ہی اس کا بہترین ہتھیار تھی۔ وہ مقابلہ کی جگہ تدبیر سے کام لیتا تھا۔ کئی راتیں اُس نے تدبیروں کے قلعے بنانے اور ڈھانے میں صرف کئے۔ آخر ایک دن ایک کامیاب تدبیر سوچ کر اطمینان سے سو گیا۔ کاک کا بادشاہ کرہی کے لوگوں کی مذہب پسندی کو جانتا تھا۔ اُس نے اہلِ مذہب کو اپنے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے اپنے ملک کے ہوشیار جوانوں کو بڑی تنخواہیں دے کر

اس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ روحانی بزرگوں اور دینی پیشواؤں کے بھیس میں جاکر وہاں کے لوگوں کو یہ قانونِ قدرت سمجھائیں کہ بدمعاش اور ظالم خود ہی اپنے عمل سے مر جاتے ہیں۔ اس لیئے کاک کا بادشاہ خود اپنے عمل سے برباد ہو جائیگا۔

انسانی طبیعت آسانی پسند اور آرام طلب ہوتی ہے جب کاک کے ہوشیار جاسوسوں نے مذہبی علما کے بھیس میں یہ کہہ کر پھرنا شروع کیا کہ کاک کا بداطوار بادشاہ خود ہی ہلاک ہو جائے گا تو ان میں جنگی جوش کم ہو گیا اور بدی کا نتیجہ جلد دیکھنے کے آرزومند ہو گئے۔ نوجوانوں نے جن کا جنگی جوش ان کی عقل سے بھی آگے ہوتا ہے یہ کہنا شروع کر دیا کہ صاحبو ظالم کی سلطنت چند سالوں میں خود ہی مٹ جائے گی۔ کاک کے عیاش مگر سمجھدار بادشاہ نے خود ہی ایسا لٹریچر شائع کر کے کری میں تقسیم کیا جس میں کری کے لوگوں کو پچھلے صحیفوں کی بنا پر یقین دلایا گیا تھا کہ عنقریب کاک میں بغاوت پھوٹے گی اور باغی اپنے بادشاہ کا سر نیزوں پر لئے پھریں گے۔ لوگوں نے کہا دیکھا اسکی بربادی کی پیشگوئیاں پہلے ہی موجود ہیں۔ اس کے لچھن ہی ایسے ہیں کہ خود ہی برباد ہو جائے۔ ان ہتھکنڈوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کری کے باشندے جو جوشِ غیرت میں جان تک قربان کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے اب اپنے ملک

کی فوجی تیاریوں کو فضول خرچی سمجھنے لگے اور فوجی ٹیکس کے خلاف اظہار غم وغصہ کرنے لگے۔ جب حکومت نے ذرا زیادہ دبایا تو ملک میں بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے۔ بادشاہ اس خیال سے کہ عزت تو گئی تھی کہیں ملک بھی نہ جائے بالکل دب گیا۔ کاک پر حملہ کا خیال چھوڑ بیٹھا۔ اب بادشاہ اور رعایا دونوں قانونِ قدرت کا عمل اور پیشگوئیوں کی صداقت کی امید پر بیٹھ گئے۔

کاک کے زیرک بادشاہ نے مذہب کے میدان میں اپنی فتوحات کو اور بڑھایا۔ تھوڑا سا خرچ اور کر کے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک سال کے اندر ایک سلطنت میں جو مخالفت کے طوفان کو فرو کر سکے وہ اور حوصلہ کیوں نہ کرے۔ چنانچہ جاسوسوں کی جماعت میں اور اضافہ کر کے ان کے نام نیا فرمان جاری کیا کہ کرہی کی سلطنت کے لوگوں میں یہ بات پھیلاؤ کہ تقدیر سب کچھ ہے تدبیر کچھ بھی نہیں ہوتی۔ جو منظورِ خدا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ سمجھدار جاسوس اس تعلیم کو لے اڑے یہ تعلیم بھی ان کے مزاج کے عین مطابق اتری۔ ہر جگہ تدبیر اور تقدیر پر بحثیں اور مناظرے ہو کر تقدیر کے حق میں فیصلہ ہوتا تھا۔ لوگوں کو کیا معلوم تھا کہ مناظر دوسری حکومت کے جاسوس ہیں اور وہ تقدیر کی فوقیت بنا کر ان کی قوتِ عمل کو فنا کرنا چاہتے ہیں۔

کرہی کے لوگ تو تقدیر کو رو رہے تھے۔ کاک کا بادشاہ اندر ہی اندر جنگی طیاریوں میں بھی مصروف تھا۔ تیسرے سال اُس نے تیسری تدبیر پر عمل شروع کیا۔ یعنی اہل اللہ جاسوسوں کا ایک اور محکمہ بنایا۔ جن کو یہ کام سپرد ہوا کہ لوگوں کو تقدیر اور دعاؤں کے اثر کا قائل کریں۔

فنِ پروپیگنڈا کے ماہر جاسوسوں نے طول و عرض ملک میں پھر کر تعویذ دعا کے متعلق افسانے تراشنے شروع کر دیئے۔ قوموں اور ملکوں کی تقدیریں بدلنے کا یہی واحد ذریعہ بیان کیا۔ لوگوں کے طبعی رجحانات اور سمجھدار جاسوسوں کی نشر و اشاعت سے دعاؤں اور تعویذوں پر بھروسہ اہلِ کرہی کا روزانہ معمول ہو گیا۔

اب وہ وقت آگیا جب کہ شاہ کاک اپنے ترکشِ تدبیر کا آخری تیر بھی نکال لے۔ اِس غرض کے لئے اس نے محکمہ جاسوسی کے افسرِ اعلیٰ کو تخلیہ میں طلب کیا۔ کچھ سمجھایا اور رخصت کر دیا۔

وہ چار ماہ کے بعد کرہی کے مذہبی مطلع پر آفتاب بن کر چمکا اس کے تقدس کا شہرہ سُن کر اکثر لوگوں نے اُس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ورد و وظائف سے اس کا کوئی وقت خالی نہ جاتا تھا۔ اس کی بزرگ صورت اور عمدہ سیرت سب کو متاثر کر رہی تھی۔ اس نے اعلان کیا کہ اسے رویا میں دکھایا گیا ہے کہ شاہِ کاک کی طرف سے ہمارے وطنِ عزیز کو کچھ

خطرہ درپیش ہے۔اس لئے دعاؤں میں معروف رہو۔

اس اعلان کے چند ماہ بعد سرحد کے سرداروں نے شاہ کسریٰ کو اطلاع دی کہ شاہ کاک بڑے جرار لشکر کے ساتھ حملہ کر رہا ہے۔ اس خبر وحشت اثر نے سب کو سراسیمہ کر دیا۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت پیر صاحب کی بات پوری ہو گئی۔ اب کیا تھا امراء و عمائدینِ دربار بھی ان کی توجہ کے منتظر ہو گئے۔ بعض لوگوں کی طرف سے اشتہار عام شائع کیا گیا کہ وزراء سلطنت حضرت پیر صاحب سے استمداد حاصل کریں۔ عدم تیاری کی صورت میں حضرت پیر صاحب کی توجہ سلطنت کا آخری سہارا تھی۔ فقیر بادشاہ کے دربار میں طلب کیا گیا مگر اس نے صاف جواب دے دیا کہ فقیروں کا دربار شاہ و گدا دونوں کے لئے کھلا ہے۔ ناچار شاہ امراء کو لے کر پیر صاحب کے حضور میں پہنچا۔ دیکھا کہ ایک بزرگ صورت شخص کمبلی اوڑھے مصلّے پر بیٹھا یادِ خدا کر رہا ہے۔

اسے اطلاع تھی کہ شاہ آرہے ہیں لیکن وہ خود شہنشاہ بنا بیٹھا تھا آنکھ بھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ کون آیا ہے۔ ایک بوریا نشین کی اس حرکت سے بادشاہ کا غرور خاک میں مل گیا لیکن بادشاہ بھی آخر انسان ہے۔ ضرورت یوں ہی انسانوں سے خاک چھنوایا کرتی ہے۔ اگر فقیر کی دعا سے اتنی بڑی بلا ٹل جائے تو تھوڑی سی خفت گوارا کرنے میں کیا مضائقہ تھا۔

شاہ نے ادب سے عرض کی حضور دعا سے بلا رد کر دیجئے۔

اِس بزرگ گوشہ نشین نے دعا کی اور کہا جاؤ فتح ہوگی۔ تمہارے محل سے دس میل کے فاصلہ پر جانب غرب پیپل کا بڑا درخت ہے اس جگہ ایک دفینہ ملے گا جو سلطنت کی موجودہ پریشانیوں کو دور کر دے گا آئندہ جب بھی جو مشکل مشورہ درپیش ہو اس فقیر کے پاس بلا تکلف چلے آنا۔

بادشاہ خوش خوش لوٹ گیا۔ شہر میں شور ہوا کہ حل المشکلات بزرگ نے سلطنت کی بگڑی بنا دی۔ سرکار کے زیرِ اہتمام دفینہ کا پتہ لگایا۔ تو معلوم ہوا کہ واقعی کروڑوں روپیہ زر نقد پیوند زمین ہے پھر کیا تھا بزرگ گوشہ نشین کو شاہی محل کی اونچی مسند پر بٹھا دیا گیا۔ چھوٹے سے لیکر بڑے تک اسی کے اشارۂ ابرو کے منتظر رہنے لگے۔ اس واقعہ کے دو ہفتے بعد خبر آگئی کہ دو فوجوں میں ابتدائی جھڑپ شروع ہو گئی۔ دوسرے ہفتے تک عام حملہ شروع ہو جائے گا۔ فقیر نے فوجی کونسل کو مشورہ دیا کہ سرحدات کو چھوڑ کر تیس میل پیچھے ہٹ آؤ لیکن ماہرینِ فن نے کہا یہ تباہی کا پیش خیمہ ہوگا۔ بزرگ گوشہ نشین نے کہا۔ میاں جو میں دیکھتا ہوں وہ تم نہیں دیکھتے۔ شاہ کو بھی اصرار تھا کہ بغیر چون و چرا فقیر کی بات مان لی جائے۔ اس سے دنیا کا کوئی بھید چھپا نہیں۔ اس زمانے میں کون

ہے جو زیرِ زمین خزانوں کا واقف ہو اور خود کمبل میں بسر اوقات کرے۔

فوج کو سرحد سے تیس میل واپس لوٹ آنے کا حکم دیدیا گیا بلکہ کے بہترین استحکامات بغیر مقابلہ کے دشمن کے حوالہ کر دئیے گئے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ تاہم ہر شخص کا دعا اور تعویذ پر اعتقاد تھا۔ اضطراب سے لوگ نتیجہ کا انتظار کرنے لگے۔ فوج سرحد کی بلندیوں کو چھوڑ کر نشیب میں آ گئی۔ جنگ شروع ہو گئی۔ عجب اتفاق ہُوا کہ پہلے ہی معرکہ میں شاہ کاک کی فوجیں تھوڑا سا نقصان اُٹھا کر بہت سا سامان چھوڑ کر سرحد کی طرف پسپا ہو گئیں۔ فوجی افسروں اور ماہرینِ جنگ کو دشمن کی اس غیر متوقع ہزیمت اور پسپائی پر تعجب ہُوا۔ زندقہ بھی روحانی تصرف کے قائل ہو گئے۔ شاہ فقیر کے پاؤں پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ ملک بھر میں فتح کے شادیانے بج گئے۔ ان لوگوں کا منہ کالا کیا گیا جو فقیر کی کرامات پر ایمان نہ لاتے تھے۔

اس شکست کے بعد سارا سال شاہ کاک کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ حرکت کرے۔ البتہ دوسرے سال بڑے ہی ساز و سامان کے ساتھ نکلا۔ فوجی افسروں نے بھی اب فقیر کے پاؤں پکڑے۔ فقیر نے حکم دیا کہ اب کے اور بھی سو میل ہٹ آؤ۔ دشمن کو بڑھنے دو۔ میں خود ہی دیکھ لوں گا۔ جنگی کونسل نے فقیر کے سامنے حربی نقشے رکھ کر خطرات سے آگاہ کر دیا کہ سو میل ہٹ آنے سے

ہمارے آخری استحکامات بھی دشمن کے ہاتھ میں چلے جائیں گے۔

فقیر نے ناراض ہو کر کہا کہ بہتر اپنی عقل کے مطابق جنگ کی تدبیر کرو۔ میں ملکی معاملات میں دخل نہیں دے سکتا۔ اس کھلی فتح اور خزانہ کی برآمدگی کے بعد کون جنگی ذمہ داری اٹھائے۔ سب ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ تم مقربِ خدا ہو۔ ملک کی قسمت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ فقیر نے کہا اچھا جاؤ فکر نہ کرو خدا بھلی کرے گا۔

افواج سومیل اور ہٹ آئیں بہترین استحکامات جن پر صدیوں سے روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا دشمن کے حوالے ہو گئے۔ شاہِ کاک کا نشان اونچی پہاڑی پر فتحمندانہ لہرا رہا تھا۔ صبح دونوں ملکوں میں فیصلہ کن معرکہ ہونے والا تھا۔ اُدھر ساز و سامان تھا اِدھر فقیر کی برکت اور لوگوں کی دعائیں تھیں۔ کری کے سپاہیوں تک نے ہتھیار ہاتھ سے رکھکر دعاوں کے لئے ہاتھ اُٹھائے ہوئے تھے۔ ان کی قسمت کا سارا دارومدار دعاؤں پر ہی تھا کیونکہ تدبیر جنگ کے اعتبار سے جنگی محاذ دشمن کے قبضہ میں جا چکا تھا۔ وہ اہلِ ایمان کی طرح دعا اور کرامات پر پُورا اعتقاد رکھتے تھے۔ یہ اعتقاد ہی تھا کہ سپاہی خود موت کے منہ میں کھڑے دشمن کی تباہی کی امید لگائے ہوئے تھے۔

رات کی دعاؤں کی تاثیر صبح کو ظاہر ہونی تھی۔ وہ بزرگ بھی تمام

رات مصروفِ عبادت رہا تھا۔ پَو پھٹنے سے پہلے اُس نے ایک تعویذ تیار کیا اور عقب کی پہاڑی میں اُسے دفن کرنے چلا گیا اور کہہ گیا کہ آج ہماری فوج کا کام صرف اتنا ہوگا کہ دشمن سے ہتھیار جمع کرے کیونکہ میں ان کے بازو شل کر چکا ہوں گا۔ صبح سے پہلے فقیر کی کرامات کی خبر فوج میں پہنچ گئی۔ انہوں نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ اس نعرہ کا بلند ہونا تھا کہ شاہ کاک کی فوجیں ان دعا گوؤں پر ٹوٹ پڑیں۔ کری کے فوجی سردار اور سپاہ تو ان پر آسمان سے بجلی گرنے اور پتّھر برسنے کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ وہ آسمانی بلائیں کرنا زل ہو گئے۔ اب سوائے اسکے کیا چارۂ کار تھا کہ دُعا کے ہاتھ ذرا اُونچے اُٹھا کر کہہ دیں ہم امان چاہتے ہیں۔ شاہ اور امرائے فقیر کو دیکھا اُسے کہیں نہ پایا۔ تشویش بڑھ گئی۔ اِدھر اُدھر تلاش کروائی۔ کہیں نشان نہ ملا۔ اتنے میں منحوس خبر آگئی کہ اپنی فوج نے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

صدیوں کی سلطنت منٹوں میں تباہ ہو گئی۔ شاہ کاک شہزادی اور ملک دونوں پر قبضہ جما بیٹھا۔ ملک کری پر ایک اور مصیبت آئی کہ دیار و امصار میں شور ہو گیا کہ نالائق درباریوں اور فوجی افسروں نے اس صاحبِ کشف بزرگ کو ناراض کر کے محل سے نکال دیا تھا جس کا نتیجہ ملک کو بھگتنا پڑا۔ قبل اس کے شاہِ کاک کری کے دارالسلطنت میں

پہنچے لوگوں نے غصہ کے عالم میں بادشاہ اور سرداروں کے سر قلم کر کے نیزوں پر اُٹھا لئے تھے کہ یہ ان کی سزا ہے جنہوں نے خدا کے برگزیدہ انسان کو ناراض کر کے ہمیں غلامی کی ذلت میں پھنسایا ہے۔

زیرک بادشاہ کاک نے شہر شہر میں پھرے چوکی بٹھا کر اعلان کر دیا کہ وہ کری کے لوگوں کے مذہب میں مداخلت نہ کرے گا۔ بلکہ مذہبی اور روحانی پیشواؤں کی پوری پوری امداد کرے گا۔ اس سے تمام مذہب پسند طبقہ مطمئن ہو کر شاہِ کاک کو ظلِ اللہ کہنے لگا۔ ظلِ اللہ نے بھی اراضیات کی تقسیم اور گرانقدر عطیات سے علما اور صوفیا کو سرفراز فرمایا بلکہ ان ہی کی اولاد کو ملک کے اعلیٰ مناصب دیکر عوام الناس پر ان کا اقتدار بڑھا دیا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ غلامی ملک کا مذہب ہو گیا۔ آزادی کا نام لینے والا مذہب کا دشمن قرار پایا۔

اندرما نے آہِ سرد بھری اس خیال سے کہ شاید کہانی ختم ہو گئی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ فرحت نے کہا۔ اندرما میری بات ختم نہیں ہوئی جب شاہِ کاک فتحیاب ہو کر واپس آیا تو اپنے محل میں آ کر محکمہ جاسوسی کے افسر اعلیٰ کو بلا کر گلے لگایا اور کہا کہ میں نے صرف تمہاری وجہ سے بغیر ہاتھ اُٹھائے ملک پر فتح پائی ہے۔ اے کری کے برگزیدہ بزرگ تمہارا سب سے دل پسند کارنامہ وہ ہے کہ تم نے محل سے

نکل کر فوراً ہی اپنے جاسوس افسروں کی معرفت یہ خبر پھیلا دی کہ شاہ اور درباریوں نے تجھے ناراض کر کے نکال دیا ہے۔ اس سے سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔ تمام سرکردہ دشمن اہلِ ملک کے ہاتھوں ہلاک بھی ہو گئے۔ مجھ پر الزام بھی نہ آیا۔ سب سے اہم یہ کہ اہلِ مذہب کا اقتدار اور ان پر اعتماد پہلے سے زیادہ ہو گیا۔ اب دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ اس غلط مذہب کو ملک کری میں تقویت دی جائے۔ لیکن اپنے ملک کے لوگوں کو ایسی غلط تعلیم سے محفوظ کر لیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے لوگ بھی ان کی دیکھا دیکھی اسباب فراہم کرنے سے بے خبر ہو کر محض دعاؤں پر اعتماد کرنے لگیں اور کسی وقت انہیں بھی وہی روزِ بد دیکھنا نصیب ہو جیسے آج کری کے لوگوں نے دیکھا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ اپنی فتح کے ان اسباب کو لکھ کر بطور خاندانی راز کے رکھ لو۔ تاکہ میری آئندہ نسلوں کے کام آئیں۔ نیز ہمیں آئندہ نسلوں کے علماء اور صوفیا کے طبقے کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھ کر ملک کری میں اپنی سلطنت کے دوام و استحکام کی فکر کرنا چاہئے۔ محکمہ جاسوسی کے افسرِ اعلیٰ نے تعمیلِ حکم کے لئے سر جھکا دیا۔

کری کی آئندہ صد سالہ غلامی کی تاریخ صرف یہ تھی کہ علما اور صوفیا شاہ کاک کے وظیفہ خوار تھے۔ وہ لوگوں کو آزادی کی جدوجہد

سے دور رکھتے تھے۔ لوگ دینی اور دنیاوی مشکلات کو حل کرنے کے لئے ان ہی دعاؤں اور تعویذوں پر اعتماد رکھتے تھے۔ کری کی ساری دولت کھچ کر کاک کے ملک میں آگئی تھی۔ اہلِ کاک خوشحال تھے اور اہلِ کری بدحال۔ ملک میں جو بھی ذرا اولوالعزم طبیعت کا آدمی پیدا ہوتا وہ پیری اور فقیری کو پیشہ بنا کر غریب زمینداروں اور سادہ لوح مزدوروں کو لوٹتا تھا۔

پوری صدی ملک کی یہی کیفیت رہی تا آنکہ اس ملک میں مادرِ وطن کا سچا فرزند پیدا ہوا جس کے احساسِ لطیف کو غلامی کی ذلت بارگراں معلوم ہوئی۔ اُس نے ملک کے مذہبی راہنماؤں کو سیاسی ترقی کے راستے میں دیوارِ آہنی کی طرح استادہ دیکھا۔ اِس دیوار کی شکست ملک کی فتح تھی۔ اسے لوگوں کے جمود کا پُورا علم تھا۔ اسی لئے کام کی مشکلات کا بھی صحیح اندازہ تھا۔ ایک دفعہ اُس نے ہمت ہار کر پیری کو پیشہ بنا کر فقیری میں امیری کے مزے لوٹنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ضمیر نے خدا فروشی کی اجازت نہ دی۔ پھر اُس نے وا ہیں کہا دنیا جیسے چلتی ہے چلے۔ خاموشی سے بسر اوقات کرنا ہی دانشمندی ہے۔ قدرت نے اُسے رحمدل پیدا کیا تھا۔ طبیعت کا تقاضا یہ تھا کہ اس آنی جانی دنیا میں چند روز رہنا ہے، بنی نوعِ انسان کی کچھ خدمت ضرور کرنا چاہیئے۔ ملک کو موجودہ حال میں رہنے دینا شرافت کے قرین نہیں۔ جو مجھ سے ممکن ہے کروں

باقی معاملہ اللہ پر چھوڑ دوں - کچھ نہ کچھ کرنے کا دل میں فیصلہ کر کے وہ ایک مذہبی میلہ پر چلا گیا - جہاں مذہبی علما اور روحانی پیشوا موجود تھے نواب کیلئے پہلا قدم ہی مشکل ہوتا ہے - کچھ شرماتا تھا کچھ ڈرتا تھا - آخر ایک اونچے تھڑے پر کھڑے ہو کر اُس سب کو مخاطب کر کے کہا :-

"اے پاک مذہب کے نیک لوگو !

ملک کو غلامی کے گھڑے میں گرے صدی سے زیادہ ہو چکا ہے - ہماری روح اس دنیا کے ماورا عالم کو فتح کرنے کے لئے نکلتی ہے اور ہم حیات بعد ممات پر بحث کر کے اوقاتِ عزیز کو صرف کرتے ہیں لیکن اس زندگی میں باعزت بسر اوقات کی کوشش نہیں کرتے - ملک غلام ہوا - افلاس نے ڈیرے ڈال دیئے - ہمارے نوجوانوں کی صحتیں ضائع ہو گئیں - نسل کی نسل تباہی کی طرف جا رہی ہے - آنے والی زندگی پر بحث کرنے والو آؤ اس زندگی کو بہتر بنانے کا بھی کچھ جتن کریں - ملک کے لوگوں کی ایسی خدمت کر جائیں کہ خالق راضی ہو کر آئندہ بھی ہماری مشکلات کو آسان کر دے -

مَیں خدا کا قائل ہوں لیکن خدا فروش نہیں کہ اسکے نام کو بیچ کر لوگوں میں اقتدار قائم کروں مَیں چاہتا ہوں کہ ملک کا نوجوان خدادوست ہو جائے - خدا کی گری ہوئی مخلوق کو سنبھالے اور وطن کے دشمنوں سے ملک کو آزاد کرائے مَیں سنتا ہوں کہ میرے ملک کے بدقسمت علما اور صوفیا

اجنبی حکومت کے آلۂ کار ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ سچے مذہب سے بدترین بغاوت ہے"

اُس نے دیکھا کہ سب کے چہرے خوف اور غصہ سے متغیر ہو گئے۔

کسی نے کہا۔ "مارو اس کو یہ خدا کی زمین میں فساد پھیلانا چاہتا ہے۔ پھر کیا تھا لوگ ٹوٹ پڑے مینہ کی طرح لاٹھیاں برسیں۔ سرو قد نوجوان دیوتاؤں کی طرح متانت سے کھڑا رہا۔ انبوہ نے اس کو بصد مشکل زمین پر گرا دیا۔ اتنے میں ایک نوجوان لڑکی مجمع کو چیرتی آئی اس پر بازو پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔ لاٹھیاں اسکے بازوؤں پر برسیں۔ لاچار ہو کر وہ نوجوان پر گر پڑی۔ ظالموں کے اس مجمع میں کچھ انصاف پسند غریب بھی تھے جنہوں نے موت کے منہ سے دونوں کو چھڑایا۔

یہ لڑکی کون تھی۔ پاس کے گاؤں کے غریب کسان کی بیٹی۔ آزاد ہوا کھلی فضا میں پلی تھی معمولی لباس میں گدڑی کا لعل معلوم ہوتی تھی۔ اس نیم مُردہ جوڑے کو جُوں تُوں کر کے گاؤں میں پہنچا دیا گیا۔ لڑکی کے والدین نے اس نوجوان کی محبت سے مرہم پٹّی کی۔ جب یہ پتہ لگا کہ نوجوان ایک گاؤں کے زمیندار کا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ اَور بھی خوش ہُوئے۔ جب تندرست ہو گیا تو بھی چند دن گھر رہنے پر اصرار کیا۔

لڑکی رحم کے جذبہ سے متاثّر ہو کر لوگوں کے غصّہ کی آگ میں کود پڑی تھی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ جب نوجوان کے نیک خیالات

کے باعث اس سے ایک انس سا پیدا ہو گیا۔ اچانک ملاقات بعض اوقات عمر کا رشتہ گانٹھ دیتی ہے۔ جس ملاقات میں زخم اُٹھائے ہوں وہ تو غیر فانی نقش چھوڑ جاتی ہے۔ یہ انس چند دن میں محبت کی صورت اختیار کر گیا۔ نیک عورت پاکیزہ خیالات کو کتنی جلدی اخذ کرتی ہے۔ آزادی وطن کا خیال اس نیک دل لڑکی کا اوڑھنا بچھونا ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ نوجوان کو ترغیب دینے لگی کہ اسے اس کام پر زندگی بھر ڈٹے رہنے کا عہد کرنا چاہیئے۔ مبادا شیطان صراط مستقیم سے بھٹکا دے۔

وہ اب یہاں کب تک پڑا رہتا۔ دو دلوں کے مل کر جدا ہونے کا وقت آ گیا محبت کی بہار جدائی کی خزاں میں بدل رہی تھی۔ در و دیوار حسرت سے ان کو الوداع کہتے دیکھ رہے تھے۔ درخت کچھ اداس سے کھڑے تھے۔ کائنات پر افسردگی سی چھائی تھی یہ کیا ہو گیا۔ دونوں نے دل میں کہا یہ میٹھا میٹھا درد یہ ہلکا ہلکا غم کیوں ہے۔

دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں الوداع کہی۔ پھر نوجوان پیٹھ پھیر کر چل دیا میٹھا درد گہرے زخموں کی ٹھیس ہو گئی۔ غم کالی گھٹا کی طرح چھا گیا۔ آنکھوں نے ساون کی جھڑی باندھ دی۔ خیالات نے طوفان اُٹھا دیا۔ دل کمزور کشتی کی طرح ہچکولے کھانے لگا۔ یہ تو آزادِ محبت ہے دونوں نے دل میں کہا۔

مسافت کے لحاظ سے دونوں دُور ہو گئے مگر دلوں سے قریب ہی تھے جب کوئی پاس نہ ہوتا تو ایک دوسرے کے تصوّر میں آموجود ہوتے تھے پیار کے قصّے اور محبت کے افسانے شروع ہو جاتے چشم تصوّر میں آنکھیں عشق کے دکھڑے رو دیتیں۔ عورت محبت میں بھی صابر ہے مرد اظہارِ عشق میں بے صبر۔ جدائی نے دل اچاٹ کر دیا۔ نوجوان ملنے کا بہانہ کر کے محبوب کے وطن میں آگیا۔ اس اچانک ملاقات سے لڑکی کا افسردہ چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ لڑکی کے والدین نے بھی دیرینہ دوست کی طرح نوجوان کا خیر مقدم کیا۔ اس ملاقات نے دونوں کے دل کا کنول کھلا دیا۔ دونوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے سے کسی غیر فانی رشتے میں منسلک ہو چکے ہیں۔ ان کی محبت بھری نظر غیر مختتم وفا کا عہد باندھتی تھی اور ہر مصیبت میں شریک حال رہنے کی توقع دلاتی تھی۔ محبت میں وفا کا یقین عاشقوں کے لئے کتنی بڑی کامرانی اور اطمینان کا کتنا بڑا خزانہ ہے۔ اس یقین کے بعد تو پتھروں سے جوئے شیر نکالنے کا حوصلہ کیا جا سکتا ہے۔

نوجوان قلب کا سکون لے کر چلا گیا۔ لڑکی اطمینان کی دولت لے کر بیٹھ گئی۔ اپنی اپنی جگہ دونوں سکون و اطمینان سے آزادی کا درس دینے لگے۔ انہوں نے ایک سال میں بہت سے متبعین بنا لئے

اب وہ پہاڑ کی اوٹ اور دریا کے کناروں پر اپنے جلسے کرنے لگے۔ تاکہ دشمنانِ وطن کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ اس طرح محبانِ وطن کی بڑی جماعت فراہم کر کے یہ بات طے کی کہ آئندہ موسمِ بہار میں آزادی کی مہم کا اس طرح آغاز کیا جائے کہ جب شہر شہر میں جشنِ بہار پہ لوگ جمع ہوں تو ہم میں سے ہر ایک ایک ایک شہر میں جا کر غلامی کی مذمت اور آزادی کی ضرورت پر لیکچر دے۔ اور اپنے اہلِ وطن کے ہاتھوں جو بُرا سلوک ہو اُسے برداشت کیا جائے۔

اس سکیم پر عمل کر کے اکثر نے جُوتے کھائے اور چند ایک نے زخم اُٹھائے۔ مگر غلامی کی فضا میں آزادی کا بم پھٹ گیا جس کا شور طول د عرض ملک میں سنائی دیا۔ دیہات کی بے خبر آبادی میں بھی اُس کا چرچا ہونے لگا۔ غیر ملکی حکام چوکنے ہو گئے۔ خدا فروش علما نوجوانوں پر اللہ کا غضب ٹوٹنے کی دھمکی دینے لگے۔ حکّام کی تحریک پر مذہب فروش علما اور صوفیا نے اعلان کیا کہ حکومت نے ہر قسم کی مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ یہ آزادی کا شور بے دینی ہے۔ ان آزادی خواہ شیطانوں کو جہاں پاؤ قانونی شکنجے میں پھنساؤ۔

اِن اعلانات کے بعد مذہبی راہنماؤں پر حکومت کے اکرام کی بارشیں زیادہ ہو گئیں اراضیات کے اور عطیات ملنے لگے۔ نیکی کا ارادہ

کمی رزق کی ابتدا ہے۔ نوجوان کے گھر میں فضول خرچی کے باعث پہلے بھی خدا کا نام تھا۔ اب دو سال سے فصل کم اور بیماری زیادہ ہونے لگی تھی۔ باپ بوڑھا تھا بیٹا لیڈر نہ وہ کچھ زیادہ کما سکے نہ یہ خرچ کم کر سکے۔ تحریک کا تھوڑا بہت خرچ اور دوستوں کی بُری بھلی مدد اُسے کرنا ہی پڑتی تھی۔ باپ نے ایک دن حالات سے تنگ آ کر کہا بیٹا۔ تم ملک بھر کی تنگ دستی اور افلاس دُور کرنے کے مدعی ہو اور گھر میں بھانگ بھوج رہی ہے۔ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کا جتن کر رہے ہو۔ بیلوں کو بھی کھولنا باندھنا نہیں سیکھا۔ مجھے تو تیرے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا معلوم ہوتا ہے۔ جو گھر کا انتظام نہ کر سکے وہ ملک کا کیا سنوارے گا۔

اس سچّی بات سے بیٹے کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو آ گئے۔ وہ غم کے دریا میں بہ گیا۔ والدین کے بڑھاپے میں ان کی مدد کرنے کی بجائے وہ ان کی مصیبت کا باعث ہو رہا ہے۔ نیکی کی ابتدا تو گھر سے شروع ہونی چاہئے۔ مجھے تو واقعی والدین کی زندگی میں کسی سیاسی تحریک میں حصہ نہ لینا چاہئے۔ ان ہی نیک خیالات کے زیر اثر اس نے باپ سے وعدہ کیا کہ میں تمہارے کام میں ہاتھ بٹاؤں گا اور کسی تحریک کے نزدیک نہ جاؤں گا۔ چنانچہ وہ زمینداری کے کام میں لگ لیا۔ ملکی تحریک کا حشر وہ ہوا جو نوزائیدہ بچّے کا گلا گھونٹ دینے سے ہوتا ہے۔ نوجوانوں کے ولولے سرد پڑ گئے

حکام خدا فروش علما اور صوفیا نے اطمینان کا سانس لیا۔ نیک عورت کا محبوب جب کوئی ذلیل حرکت کرے تو پہلے وہ خود اس کی بے گناہی کی دلیل دل سے پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے جب کوئی دلیل بن نہ آئے تو اسے پھر مرد کو ذلت کے گڑھے سے نکالنے کی سعی میں مصروف ہوتی ہے۔ لڑکی یہ سنکر کہ تحریک کا پُر جوش قائد ہی قدر عافیت معلوم کر کے کنارہ کش ہو گیا تو صدمہ سے کئی دن صاحبِ فراش رہی۔ اس کی نظروں میں نوجوان اب بھی معصوم تھا۔ لیکن کنارہ کشی کی دلیل کیا ہے۔ وہ سوچتی سوچتی دیوانی سی ہو جاتی۔ بزدل اور کمینے محبوب کا خیال عورت کے لئے سوہانِ روح ہو گیا۔ اس کا سارا اطمینان بے اطمینانی سے بدل گیا۔ مسرت نے آنکھوں کے سامنے جو جنت کا نقشہ کھینچا تھا وہ خاک سیاہ ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ کسی نہ کسی بہانہ سے اس کی ملاقات کروں گی اور اس کو ذلت کے گڑھے سے نکالوں گی۔

نوجوان اپنی نئی مصروفیتوں سے خوش نہ تھا۔ بلکہ وہ اپنی نگاہ میں خود ذلیل تھا وہ محسوس کرتا تھا کہ والدین کے احترام اور ملکی فرض کے درمیان اُس نے غلط فیصلہ کیا ہے۔ لیڈر کی غدّاری تو زندہ قوموں کو فنا کر دیتی ہے۔ میری غلام قوم میں تو یہ حرکت اور بھی سمّ قاتل ثابت ہو گی۔ جب وہ باہر اندر آتا جاتا تھا خاک کے ذرّے زبانِ حال سے

اسے ملامت کرتے تھے۔ دنیا اس پر تنگ ہو گئی۔ وہ ندامت کی تاریک کوٹھڑی میں بند ہو گیا۔ اب کرے تو کیا کرے محبوب کی نگاہ میں ہیٹا۔ دوستوں کی نظروں میں ذلیل ہو کر زندگی بسر کرنا کیا خوبی ہے۔ اس نے سوچا کہ اگر میں سب کے سامنے اقرار گناہ کروں تو وہ نوجوان جو مجھے آزادی کا پیغمبر سمجھتے تھے اور مجھ پر اعتبار کر کے جان جوکھوں میں ڈالنے پر آمادہ تھے میری کمزوری پر اطلاع پا کر ہمیشہ کے لئے ہمت ہار دیں گے۔ محبوبہ کی نگاہ میں عمر بھر حقیر رہوں گا۔ اس لئے مصلحت میری آخری پناہ ہے۔ خدا کے حضور میں توبہ کروں اور دوستوں کو بتاؤں کہ میرا عارضی سکوت ہماری کامیابی کے لئے ضروری تھا تا کہ مذہبی راہنما اور حکام مطمئن اور غافل ہو جائیں اور ہم اپنے کام کو نئے جوش سے شروع کر سکیں۔ آہ لیکن جھوٹ شرافت کے دامن پر بدترین داغ ہے۔ شریف موت قبول کر لیتے ہیں مگر جھوٹ سے دامن کو داغدار نہیں کرتے۔ ٹھہرو میں نے ایک اجتہادی غلطی کی ہے اب دوسری غلطی تو نہ کروں۔ جھوٹ بھی گناہ۔ ملکی تحریک کو فنا کرنا بدتر گناہ۔ جو ہو سو ہو مجھے موت قبول کر کے قوم کو غلامی کی ذلت سے بچا لینا چاہئے۔ اگر میرا شخصی معاملہ ہوتا تو میں جھوٹ بولنے پر موت کو ترجیح دیتا۔ لیکن اقرار گناہ سے قوم کے نوجوانوں میں کمزوری آجائے گی اگر دروغ مصلحت آمیز کی کوئی صورت جائز ہو سکتی ہے تو یہی ہو سکتی ہے۔

دروغ مصلحت آمیز کی اجتماعی وجہ جواز نے اسے کچھ تسلی سی دی۔ وہ ندامت کی وادی ظلمات سے نکل کر پھر روشن دنیا میں آگیا۔ گھر سے نکل کر وہ دوستوں کی تسلی کے لئے گیا۔ مایوس دوستوں کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے جھوٹ کو سچ سمجھ کر قبول کر لیا گیا۔ قرار پایا کہ آئندہ موسم بہار میں اس کے نام سے ملک کے نوجوانوں کی خدمت میں اپیل شائع کی جائے جس میں غلامی ذلت اور افلاس کی مصیبت کا اظہار کر کے انکی رگ حمیت کو جوش دلایا جائے۔ کیونکہ تقریر سے تحریر کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔

خوبصورت الپی والدین کی اجازت سے بیماری کو دور کرنے کے لئے بڑے معبد میں بھینٹ چڑھانے کے بہانے نوجوان منسر کے گاؤں میں آئی۔ جب منسر کے گاؤں میں آکر اسکے والدین سے معلوم ہوا کہ وہ ابھی اسی جنون میں مبتلا ہے اور کئی روز سے گھر نہیں آیا تو خزان دیدہ دل پر بہار سی چھا گئی اور خود اپنی جلد بازی پر ماتم کرنے لگی کہ میں معصوم پہ ناراض ہو رہی تھی۔ اگر وہ مجھے ملے تو میں معذرت ضرور کروں گی۔ کہ میں نے ایک سنگین گناہ کیا ہے۔ مرد کمزور عورت کی لغزشوں کو سنا ہے معاف کر دیا کرتے ہیں۔ اب الپی کا دل باغ باغ تھا۔ خوشی سے پاؤں زمین پر نہ لگتا تھا۔

الپی ایسی تازہ بتازہ نو بنو ہو کر گھر گئی۔ گو یا سر درد بھی ہوا نہ تھا۔

اس کے والدین اس انقلاب کو دیکھ کر خوش ہو گئے - اس کے ایک ہفتہ کے بعد منسر کچھ شرمندہ کچھ خوش گھومتا گھماتا الپی کے گھر آیا - الپی بھی کچھ شرمندہ اور کچھ شاداں اس سے ملی - اُس نے سب سے پہلے نیچی نظریں کر کے بدظنی کے گناہ سے معاف کرنے کی درخواست کی -

منسر نے بھی کچھ خوش اور کچھ شرمسار ہو کر کہا - الپی تیری بدگمانی حق بجانب تھی میں اپنی سیاسی حکمت عملی کے باعث مجبور تھا میری یہ علیحدگی آئندہ کامیابی کے لئے ضروری تھی - دیکھو تو ملک کے غدار اور سرکار کے وفادار کس طرح مطمئن ہیں - انکے نزدیک آزادی کی تحریک طبعی موت مر چکی ہے میں اس افسردگی میں زندگی کی لہر دوڑا دوں گا -

الپی نے محبت اور احترام کی ملی جلی نگاہوں سے منسر کو دیکھا -

اس ملاقات سے دونوں مطمئن تھے منسر جب کئی دن کی غیر حاضری کے بعد واپس لوٹتا تو باپ جو اس کی عدم موجودگی میں متوحش تھا خوش ہو گیا - اکلوتا بیٹا بھی باپ کا باپ ہوتا ہے -

اب موسم میں خوشگوار تبدیلی ہو رہی تھی - ہر جگہ جشنِ نوروز منایا جا رہا تھا - اب پھر منظم طریقے سے تمام ملک میں پیغام آزادی تقسیم ہوا - صدی کی غلامی کے بعد انقلاب آفریں نعرہ کیسا خوشگوار معلوم ہوا - پیغام دینے والے کے گھر گھر چرچے تھے - مذہبی راہنماؤں کو آزادی سے خدا جانے کیا بیر

تھا کہ اس پیغام کے مصنف کو مفسد قرار دینے لگے۔ اور حکومت اور پیشواؤں کے درمیان بات چیت ہوئی کہ اس فتنہ کو فرو کرنے کی کیا تدبیر کی جائے۔ سب نے حکومت کو یقین دلایا کہ حکومت کے دشمن صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں گے۔

باپ نے سوچا کہ آوارہ فرزند کو پابند کرنے کے لئے مناکحت کی زنجیریں اس کے پاؤں میں ڈال دی جائیں۔ کسی دوست نے باتوں باتوں میں منسر کے کاشانہ محبت کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ چنانچہ الپی کے والدین کے ہاں پیغام شادی دیا گیا جو بلا تامّل قبول کر لیا گیا۔ دونوں گھروں میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ آخر خدا نے وہ دن دکھایا جب دوست اور سہیلیوں کو بلا گدگدائے ہنسی آتی ہے اور وہ ہنسی ہنسی میں چٹکیاں لیکر ضبطِ طبیعت کا امتحان لیتے ہیں۔ برات تیاری باندھ کر چلی منسر کے لئے الپی کا گاؤں جنت کے راستہ کی طرح خوشگوار تھا۔ سارے ماحول میں مسرت کی پریاں رقص کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ الپی اگرچہ لباسِ عروسی پہنے سہیلیوں کے جُھرمٹ میں سر جھکائے بیٹھی تھی لیکن تصوّر میں محبت کا دیوتا منسر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بارات دروازہ پر آ گئی۔ الپی کی سہیلیاں استقبال کے لئے اٹھیں۔ اتنے میں شور ہؤا دریافت پر معلوم ہؤا کہ دولہا گھوڑے سے اتر رہا تھا کہ کسی نے زہر بجھے خنجر کا وار کر کے

اس کا کام تمام کر دیا ہے۔ جلد جلد دلہن کی شہابی چوڑیاں توڑ دی گئیں۔ الپی کچھ دیر سکتے میں رہی۔ سانس سینے میں رک گیا۔ کلیجہ منہ کو آگیا۔ اس نے کہا خدا کرے ناخوشگوار خواب ہو۔ یہ کہہ کر وہ دوڑتی دروازے پر آئی۔ منسر کی خون آلود لاش کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لوگ سامنے سے ہٹ گئے۔ وہ تصویرِ غم بنی ہنیند کے ماتے محبوب کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں مگر ان میں آنسو نہ تھا۔ پھر اس نے لاش کو مخاطب کر کے قسم کھائی منسر تیرا انتقام لیا جائے گا اور تیرے ارادے کی تکمیل کر دی جائے گی۔ اس اچانک موت نے اسکے دل کی دنیا برباد کر دی۔ فرطِ غم کے باوجود اس کی آنکھوں میں کسی نے آنسو نہ دیکھا۔

قاتل موقعہ واردات پر گرفتار ہو گیا تھا لیکن حکومت کے ایما پر جرم کی سزا سے محفوظ ہو گیا۔ ملک میں اس سانحہ کو سن کر آگ لگ گئی الپی نے لباس عروسی میں ملک بھر کا دورہ کیا۔ آتش بیان عورت نے غم کی تصویر بن کر ابھارا۔ منسر کو لوگوں کی نظر میں آزادی کا دیوتا بنا کر دکھایا۔ اس ہلچل کو فرو کرنے کے لئے فوجی قانون کا اعلان کر دیا گیا۔ تمام اسلحہ سرکار میں داخل کرنے کا حکم ہو گیا۔ الپی اب تمام ملک کی سردار قرار پائی۔ اُس نے اعلان کیا کہ منسر کی روح کی خوشی اس میں ہے کہ

اسلحہ داخل کرنے کے حکم کی تعمیل نہ ہونے پائے۔ کاک کے فوجی سرداروں نے ملکی لوگوں کا ہجوم اور غصہ دیکھ کر حکم کی جبری تعمیل کو ناممکن سمجھا۔ اور ملک کی خطرناک صورتِ حال کو لکھ بھیجا۔ شاہ کاک نے مثل سابق پیروں اور فقیروں سے کام لینا چاہا۔ ہوشیار الپی نے اعلان جاری کر دیا کہ لوگو اِن کے فریب سے بچو جو خدا کے نام پر تمہارے حوصلوں کو پست کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں جنگِ آزادی سے دُور رکھنا چاہتے ہیں۔ دکھوسر کی روح اب بھی تمہاری طرف امید لگائے بیٹھی ہے کہ تم آزادی کا عزم لیکر اٹھو گے اور اپنے غلام ملک کو آزاد کراؤ گے۔ حکومت کے آلۂ کار پیشواؤں پر خدا کی لعنت۔ ان کا روزِ حساب بھی آپہنچا۔ جلدی سچے مذہب کی فتح ہوگی۔ سچا مذہب یہ ہے کہ ملک کو آزاد کرا کر اور لوگوں کی خدمت کر کے اپنے خالق کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ دُعاؤں کے لئے ہاتھ اُٹھائے جائیں مگر سعی اور قربانی سے دریغ نہ کیا جائے۔ لوگو! خدا اُن ہی کی مدد کرتا ہے جو مسلسل قربانیوں سے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کریں۔

اندرما! فرحت نے کہا جب غلام ملک آزادی کی ٹھان لے تو اس کا حصول گنے دن کی بات ہوتی ہے۔ تفصیل میں گئے بغیر سمجھ لو کہ کیا صورتِ حالات ہوئی ہوگی۔ آزادی کی کامیاب جنگ لڑنے کے بعد الپی کی طبیعت میں عجیب انقلاب آگیا۔ محبت کے زخم پھر

سے ہرے ہوگئے۔ پہلے تو انتقام کی آگ سینے میں لگی تھی۔ اب محبت کا دریا جوش میں آگیا۔ وہ آنکھیں جو کافی دیر سے نمناک نہ ہوئی تھیں فتح کے بعد منسر کی جدائی میں خون کے آنسو رونے لگیں۔ پھولوں کے تازہ ہار لے کر اور لباس عروسی پہن کر منسر کی قبر پر جایا کرتی اور قبر سے لپٹ کر روتی۔ اس طرح آنسوؤں کے تحفے محبوب کی سرکار میں پیش کیا کرتی تھی۔ وہ بوڑھی ہوگئی مگر اس کی محبت جوان رہی۔ ہر روز اس کا یہی معمول رہا۔ تا آنکہ موت نے محبوب کے پہلو میں اسے ابدی نیند سلا دیا۔

اندرا خیال کی دنیا میں مدت تک کھوئی رہی۔ فرحت اسے اسی حال میں چھوڑ کر رخصت ہوا۔ اب اندرا کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے کئی دن تک بستر چھوڑنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ دن بھر شہر میں فساد کی تیزی کا حال سن کر سخت قلق محسوس کرتی تھی۔ پریشان ہو کر کہتی تھی کہ میرے ملک کے لوگ انسان کب بنیں گے۔ اہل وطن اہلِ وطن سے محبت کرنا کب سیکھیں گے۔ اگلی رات جب فرحت اندرا کی ملاقات کے لئے آیا تو اندرا نے کہا: کل کی کہانی تمام اہلِ مذہب طبقہ کے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ مذہب خدا اور مخلوق

کے درمیان پاک رشتہ ہے اسے سفلی اغراض کے لئے استعمال کرنا مذہب کی توہین ہے۔ سچا مذہب تو دنیا کی سربلندی کا ضامن اور مخلوق کی خدمت کا مدعی ہونا چاہیئے۔ وہ مذہب جو انسان کو غلامی کی ذلت میں پھنسائے۔ خدمت کی جگہ خود غرضی سکھائے انسانی توجہ کا مستحق نہیں۔ عمل سے عاری کر دینے والی عبادت، دنیا سے بے خبر رکھنے والے وظائف بے شک قوموں کے لئے پیغام موت ہیں۔ اگرچہ میں نے یورپین طرزِ معاشرت کو قبول کر لیا ہے لیکن سچا مذہب میری جان ہے۔ جان دے کر اگر میں اہلِ ملک کے کام آؤں تو اسے میں خالق کی بہترین عبادت سمجھونگی۔

فرحت نے بات کاٹ کر کہا۔ اندر ماکل میں نے خدا فروشوں کی کہانی سنائی تھی آج عیش کوشوں کا قصہ سناتا ہوں۔

عیش کوش

اس زمانہ کا ذکر کرتا ہوں جب طوفانِ نوح سے پہلے اس دنیا اور چاند کے باشندوں میں نامہ و پیام تھا۔ چاند کی وسیع دنیا کچھ تو صحرا اور دشوار گذار پہاڑوں پر مشتمل ہے اور کچھ حصہ میں کائنات بھر کے بہترین مرغزار ہیں۔ ندیاں پیچ اور بل کھاتی ہوئی ادھر ادھر نکل جاتی ہیں۔ وہاں موسمی تغیرات ایسے خوشگوار اور آب و ہوا ایسی عمدہ ہے

کہ لوگ عمر بھر جوان رہتے ہیں۔ وہاں خزاں چند دن اور بہار تمام سال رہتی ہے۔ رزق کی فراوانی نے سب کو تن آسانی پر مائل کر رکھا تھا۔ قدرتی نظاروں کی افراط اور فارغ البالی نے ہر کہ ومہ کو دل پھینک بنا رکھا تھا۔ کہیں عشق حسن کے پیچھے جھومتا پھرتا تھا اور کہیں حسن عشق کے ساتھ لگا لگا چلتا تھا۔ نازوالوں کا انداز تو ہونا ہی تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی حسن سے کم بہرہ پائے ہوئے لوگ بھی شتر غمزے کرتے تھے۔ وسیع فرصتیں شعر و شاعری میں گذرتی تھیں۔ مہر و محبت کے افسانے کہے جاتے۔ رنگ رواگ کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ پری وش عورتیں گھنگھرو پہن کر ناچتے ناچتے دل کی دنیا میں شورِ قیامت اُٹھا دیتی تھیں۔ جنسِ لطیف آرائشِ حسن کرے اس کا حق ہے۔ یہاں مردوں کو زیب و زینت پر اصرار تھا۔ مخمل کے پاجامے ریشم کی قمیصیں۔ آنکھوں میں کاجل۔ کانوں میں بالیاں پہن کر ٹھمک ٹھمک کر نکلتے۔ مکتب کے لڑکوں اور گھر کی لڑکیوں میں چنداں تمیز نہ رہی۔

چین کے لوگ جو اب افیون نوشی کے باعث ناکارہ ہو گئے ہیں اُس زمانے میں دنیا کے لوگوں میں سب سے زیادہ اولوالعزم تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ چاند کے مرد عورتوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ ہوائی جہاز و کو بجلی کی مدد سے اُڑا کر چاند میں پہنچے۔ چاند کے لوگوں کو حسن کا آفتاب

پا لیا۔ وہ چین کے پستہ قد باشندوں کے سامنے یوں ہتھیار رکھ کر کھڑے ہو گئے جیسے طرح مسلح ڈاکوؤں کے سامنے محلات کی نازنین زیور اُتار کر رکھ دیتی ہیں۔ مٹھی بھر لوگوں نے اربابِ عیش و نشاط پر قابو پا لیا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے ہوشیار اور لالچی چینیوں نے چاند کے چند سرداروں کو قابو کر کے اُن کے آرام کا پورا سامان کر دیا۔ اور ان کے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے ملک کے خزانوں کو کسی نہ کسی بہانے لوٹ کر اپنے ملک کو لے گئے اور عوام کے گھروں میں مٹی کے توے چڑھا دیئے۔ فاقہ کشوں نے فاتحین کی ملازمت اختیار کر لی۔ چاند کا ملک اجیروں کی بستی بن گیا۔ ان کو ٹکے ٹکے دوسروں کی جان لینے کی غرض سے کچھ لوگوں کو عسکری تربیت بھی دی گئی۔ تھوڑی بہت تعلیم کا بندوبست بھی رکھا تاکہ ملک کے نظم و نسق میں سہولت ہو۔ لیکن اس تعلیم اور تربیت میں یہ احتیاط رکھی کہ حبِّ وطن کا جذبہ اور آزادی کا خیال پیدا نہ ہو۔ چاند کا ملک چین کی محکومی میں مدت تک چلا آیا جب کسی ملک پر فوج کشی کی ضرورت پڑتی تھی تو چاند کے اجیروں کو خرید کر ہوائی جہازوں کے ذریعہ دوسرے ممالک میں اپنی سرکردگی میں جنگ کرواتے۔ اس طرح آدھی دنیا چین کے زیرِ نگین ہو گئی۔ چین کا ملک دنیا کی دولت سے مالا مال ہو گیا۔ وہاں کے بازاروں میں بہت رونق تھی

وہاں کی سڑکیں ربڑ سے بنائی گئی تھیں۔ وہاں سونے کے محل اور چاندی کا فرش تھا۔ دنیا کو اہلِ چین کی دولت سے تعرض نہ تھا لیکن سب اہلِ چاند کی حرکتوں سے سخت آزردہ تھے۔ جو اپنی جان کے خوف سے اپنے ملک میں بغاوت پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ اہلِ چین کا ان پر ایسا جادو تھا کہ وہ ان کے جھنڈے تلے عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کرنے سے ذرا دریغ نہ کرتے تھے۔ جب کبھی دنیا میں جنگ ہوتی تو ان کی فوجیں پیش پیش رہتیں۔ چاند کے سردار تھوڑے سے منافع پر اپنے اس ملک میں سے غریب لوگوں کو فوج میں بھرتی کروا کر چینیوں سے مناصب حاصل کرتے۔ ان کو خدا کا خوف تھا نہ لوگوں کی شرم تھی۔ رات دن اپنے عیش یا اجنبیوں کی خوشنودی کا خیال تھا۔ چینیوں کی لوٹ کھسوٹ سے اہلِ چاند کی آبادی افلاس سے تنگ آگئی تھی لیکن اُجرت پر دنیا کے ممالک فتح کر کے اہلِ چین کے حوالے کرنا ان کا واحد پیشہ رہ گیا تھا۔

جس ملک کی تعلیم ناقص اور تربیت خراب ہو اس کا خدا حافظ ہے۔

چاند کے چند غیور لوگوں نے اپنے اہلِ وطن کی ذلت کو محسوس کر کے لوگوں کو اجرت پر غیر ملک فتح کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن چاند کے سرداروں کی کوششوں سے وہ باغی قرار دیئے گئے۔ عبرتناک سزاؤں نے دوسروں کو اس بارے میں دانا کر دیا۔ مدت کی غلامی نے

اعلیٰ مقاصد کے لئے مسلسل قربانی کے جذبہ کو فنا کر دیا تھا۔ ان میں چند
کبھی ملک کی آزادی کے پاک جذبہ کو لیکر اُٹھتے بھی تھے تو قید و بند کی
تھوڑی سی مصیبت اُٹھا کر ہمت ہار دیتے تھے۔ چین کے بڑے بڑے
حکیموں نے ایک ایسا سفوفِ غلامی ایجاد کیا جس کی ایک مٹھی ہوا
میں اڑا دی جائے تو ایک بڑے ملک کے لوگوں کے خون میں حرارت
اور غیرت کی ایسی کمی ہو جائے کہ وہ نسلاً بعد نسل غلامی پر قانع ہو جائے۔
بدقسمتی سے یہ سفوف تیار ہو گیا۔ جو محض چاند کی آب و ہوا میں موثر
ہو سکتا تھا۔ اہلِ چاند پہلے بھی عیش کوش تھے۔ اب تو سفوفِ غلامی
کی تاثیر سے ایسے ہو گئے کہ آزادی کا خیال بھی ذہن سے نکل گیا۔
البتہ اجرت پر دوسروں کا گلا کاٹنے میں بدستور شیر تھے۔

اس دنیا کے داناؤں نے سوچا کہ چاند کی ان سب بے غیرت بلاؤں سے
نجات کیونکر ہو۔ سیاست دانوں نے علمِ اقتصاد کے ماہروں کے نظریہ کو
قبول کر لیا کہ چین سرمایہ دار ملک ہے اور اہلِ چاند غریب۔ اپنے اپنے ملکوں کا
نظامِ حکومت اشتراکی اصولوں پر چلانا چاہئے تاکہ ہماری دیکھا دیکھی چین اور
چاند دونوں ملکوں کے غریبوں اور مزدوروں کو ہوش آئے اور وہ روپے
کے عوض ظلم کرنے والے لوگوں کو خود درست کر دیں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں
کہ اشتراکی نظام سرمایہ پسندوں کے لئے مضر ثابت ہوا لیکن چینی اور چاند

کے سرمایہ داروں نے کامل اتحاد کر کے چاند کے غریبوں کا رہا سہا کچومر نکال دیا۔ اب وہ اور بھی تھوڑی اجرت پر چین کے حکمرانوں کی استعماری ہوس کو پورا کرنے لگے۔ اور ملکوں کے بلند ہمت غریب اور مزدور اگر بے کار ہو جاتے تو ایجی ٹیشنیں کرتے تھے۔ چاند کے مفلس تنگ آتے تو خودکشی کرتے لیکن نظامِ حکومت کے خلاف منظم ہونے کی ہمت نہ کرتے تھے۔ اس طرح جب چاند کے اجیروں کے بل پر چینی حکومت کی جوع الارض اور بھی بڑھ گئی تو پھر دنیا کے داناؤں کا اجتماع ہوا ایک لقمان صفت حکیم نے حالات کی تحقیق کر کے کہا کہ اہلِ چاند کو ضرور کوئی مرض ہے۔ ورنہ آزادی کی خواہش اور ترقی کا جذبہ تو کم و بیش حیوانوں میں بھی ہوتا ہے۔ یہ کیسے انسان ہیں کہ خود غلام ہیں اور دوسروں کو غلام کرتے ہیں۔ پھر بھی انسان کہلاتے ہیں۔ زود اثر دواؤں سے انکے دماغ کا تنقیہ کرنا وقت کی بہترین دوا ہے۔ میں نے مختلف دماغی عوارض کے لئے جڑی بوٹیوں کی چٹکی بنا رکھی ہے۔ جسے اگر آگ میں جلا کر دماغ کو دھونی دی جائے تو ایک ہفتہ میں عقل کو صیقل ہو جاتا ہے۔

یہ حکیم اپنے علم اور فہم کے باعث عزیزِ جہاں تھا۔ لوگ اس کی بات کو صحیفہ آسمانی سمجھتے تھے۔ اگرچہ اس طریقۂ علاج کی عقل قائل نہ ہوتی تھی مگر دل حکیم کا گرویدہ تھا۔ اس لئے سب نے اس کا تجربہ کرنا مناسب سمجھا۔ کچھ

نوجوان دوائی کے بھرے جہاز لے کر چاند کی سرزمین میں اترے جسب ہدایت
مختلف شہروں میں پھیل کر رات کے وقت دوائی کو آگ میں جلایا۔
دھواں آبادیوں میں پھیل گیا۔ چاند کی ہوا دوا کی تاثیر کو کندھوں پر اٹھائے
بلاد و امصار میں چلی اور ناک کے راستے سب کے دماغ میں پہنچی۔

ابھی سورج نہ نکلا تھا کہ چاند کے لوگ بھی دوائی کی تاثیر سے مجبور
ہو کر گھروں سے نکلے اور مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ انکی
ناک میں ہلکی ہلکی جلجلاہٹ سی ہوتی تھی اور ریشہ بہتا تھا۔ باوجود چھینک
لانے کی کوشش کے چھینک نہ آتی تھی۔ دماغ کچھ بھاری تھا آنکھوں
پر کچھ بوجھ سا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں مارتے تھے تاکہ چھینک
آئے تو خلاصی ہو۔ سورج کے نکلنے کا بیتابی سے انتظار تھا۔ منٹ بیقراری
کی گھڑیاں تھے۔ آفتاب کی صحت بخش کرنوں کے استقبال کے لئے
جس کو دیکھو منہ کھولے ناک آگے کئے کھڑا ہے۔ الٰہی کب سورج نکلے اور
چھینک آئے۔ دماغ صاف ہو اور ناک جلجلاہٹ دور ہو۔

جونہی آفتاب کا کنارہ نمودار ہوا۔ لوگ ناک اونچی کر کے چھینکوں
کے لئے تیار ہو گئے۔ کئی ایک نے باوجود چھینک نہ آنے کے تنگ آکر
یونہی آچھ آچھ کرنا شروع کر دیا۔ مگر طبیعت برابر بے قرار رہی۔ جب پورا
سورج نکل آیا تو سب پر خدا نے فضل کیا۔ آچھ آچھ کر کے سب نے چھنکنا

تو کل پڑے۔ رات جُوں توں کر کے کٹی۔ صبح پھر سورج نکلتے ہی لوگ کل والے کام میں مصروف ہو گئے۔ اب کسی کو ہنسی نہیں آتی۔ کیونکہ بات مذاق سے گذر کر باعثِ فکر ہو رہی تھی۔ ہر شخص چھینکتا جاتا تھا اور انجام بخیر ہونے کی دعا بھی مانگتا تھا۔ غلام قومیں قولی عبادت پر بڑا اعتقاد رکھتی ہیں۔ پھر ہر چھینک پر کوئی نہ کوئی کلمہ کلام پڑھنے لگے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مایوسی میں دعا بھی روا ہو جاتی ہے۔ مگر باوجود عالمِ اضطراب میں دعا مانگنے کے چھینکوں میں کمی نہیں آتی ان کی چھینکوں کے شور سے پرندے دن کو ہی جنگلوں میں واپس چلے گئے۔ جب پرندے دن کو بسیرا ڈھونڈنے چلے گئے تو اہلِ چاند نے سمجھا کہ کوئی قیامت آیا چاہتی ہے۔ وہ اور بھی متردد ہو گئے۔ کیا تعجب تھا کہ وہ سر پیٹ لیتے مگر چھینکوں نے فکر اور عمل کی گنجائش ہی نہ چھوڑی تھی۔ چھینک پر چھینک آ رہی تھی کسی کو کچھ سوجھتا نہ تھا۔ ایک چھینک میں ایک خیال آتا تھا۔ دوسری چھینک میں نکل جاتا تھا۔

یہ غریبوں اور منکسر المزاج لوگوں کی حالت تھی۔ سرمایہ دار اور مغرور امیر اس آفت سے محفوظ تھے۔ اور ابتدا میں مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔ پھر جوں جوں لوگوں کی حالت غیر ہوتی گئی یہ اپنی عافیت کے خوف سے کہ مبادا عوام غصہ سے ان پر ٹوٹ پڑیں بظاہر خاموش ہو گئے۔ لیکن جب گھروں میں جاتے تو دروازے بند کر کے خوب ہنستے۔

چھ دن غریب لوگوں کی یہی کیفیت رہی۔ ساتویں روز آہستہ آہستہ افاقہ ہو کر شام تک سب کو مکمل آرام ہو گیا۔ امرا کو پھر مذاق کی سوجھی وہ ان کی حالت گذشتہ کا ڈرامہ کھیلنے لگے۔ غریب کا دماغ اور ذہن زکام نے صاف کر دیا تھا وہ بھی سوچنے لگے کہ یہ امرا بھی عجب لوگ ہیں ہم پر مصیبت آئی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ مگر ہمدردی کا ایک کلمہ تو کجا الٹی پھبتیاں اڑاتے ہیں ہم ہیں کہ انکے اشارۂ ابرو پر قربان ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ہم اس ذلت سے نکلیں ہمارا ملک جو کائنات کی جنت گاہ ہے اسے آزاد کرائیں اور اہلِ دنیا بھی ہماری مصیبت سے رہائی پائیں۔

اس انقلابِ خیال کا علم جب اہلِ دنیا کو ہوا تو ان اجیروں کے ہاتھ سے امن پانے کے تصوّر سے خوش ہو گئے لیکن اس حکیم نے کہا کہ ابھی ایک مرحلہ درپیش ہے۔ ڈر ہے کہ اگر چاند کے سرمایہ داروں کا دماغ درست نہ کیا گیا تو جو ذہنی انقلاب عوام میں ہوا ہے وہ پھر اپنی اصلی حالت میں لے آئیں گے۔ مناسب یہ ہے کہ ایک اور دوائی لے جا کر اسی ترکیب سے ہوا میں اڑا دی جائے کہ ان سرداروں کے دماغ میں جو فاسد مادہ جمع ہے اسکی اصلاح ہو جائے۔ ان کا دماغ کھجلائیگا اور خود بخود دل جوتے کھانے کو چاہے گا۔ چھ روز تک جڑی بوٹی کا اثر قائم رہے گا ساتویں دن اس کھجلی سے افاقہ ہو گا اور ساتھ ہی طبیعت بھی اصلاح پذیر ہو جائے گی۔ وہ غریب کی جان کو اپنی

جان کی طرح عزیز سمجھنے لگیں گے۔ اپنے عیش کو چھوڑ کر ملک کی آزادی کے جذبے سے سرشار ہو جائینگے اور غیروں کا آلۂ کار بننے سے انکار کر دینگے۔ یاد رکھنا چاہیئے وطن دشمنی اور نخوت بھی دماغی مرض ہے۔ اس مرض کے علاج کے لئے بھی یہی تجویز بہترین ہوگی۔

چنانچہ اس بارہ میں بھی حکیم کے علاج کو موثر سمجھ کر اسی نسخہ پر عمل ہؤا۔ دوائی کا دھواں ہوا میں مل کر سب سرداروں کے دماغ میں پہنچا۔ صبح ہوتے ہی سچ مچ سب کا سر کھجلانے لگا اور جُوتے کھانے کو جی چاہنے لگا۔ ہرچند یہ حرکت بڑی ذلّت آفریں تھی لیکن مرض کے ہاتھوں سب مجبور تھے۔ سب سرداروں نے کھلی ہوا میں کھڑے ہو کر عوام کے آگے سر کر کے کہا کہ برائے خدا انکی یہ خدمت انجام دیں۔ عوام نے ایک تو یہ قیاس کیا کہ ان کے دماغ چل گئے ہیں۔ دوسرے انہیں یہ جرات ہی نہ ہوتی تھی کہ وہ یہ کام کریں۔ ناچار مغرور سرداروں نے اپنے سر پر خود جوتے مارنے شروع کئے۔ سارا کنبے کا کنبہ اسی حال میں ہے کہ اپنے اپنے سروں پر جُوتے مار رہے ہیں جب تک جُوتا چلتا رہا کھجلی کو آرام رہا۔ جب ذرا ہاتھ رُکا پھر کھجلی شروع ہوگئی۔ جب وہ اپنے سر پر اپنا جوتا چلاتے چلاتے تھک گئے تو مجبور ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے لگے۔ گھر بھر میں جوتا اس طرح چل رہا ہے کہ چٹاخ پٹاخ کی آواز سے محلہ گونج اُٹھا تھا۔ باپ بیٹے پر ہاتھ صاف کرتا تھا اور بیٹا باپ کی خبر لیتا تھا۔ بیٹی ماں کی خدمت کرتی تھی۔ ماں بیٹی سے

اظہارِ محبت کرتی تھی۔ ہر ایک ایک دوسرے کے غم میں شریک تھا عزیز عزیز کے ہاتھ سے جوتا کھا کر اور اُسے لگا کر محبت کا حق ادا کرتا تھا۔ یُوں ایک دوسرے کا غم کھاتے رات ہو گئی۔ سب تھک ہار کر سو گئے جوں ہی سورج نکلا پھر وہی مرض عود کر آئی۔ پھر لگے ایک دوسرے سے اظہارِ محبت کرنے لیکن دو گھنٹے کے اندر انکے بازو شل ہو گئے۔ سرمایہ داروں نے محلہ میں کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جو آفت ہمارے سر پر آن پڑی ہے وہ جُوتے سے ٹالو۔ عوام کو بڑے بڑے لالچ دیئے لیکن غربا کے ذہن میں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ وہ لالچ میں آ کر خدمت کو تیار نہ تھے۔ بلکہ رحم اور خدمت کے سچّے جذبہ سے متاثر ہو کر لاچار کفش کاری کرنے لگے۔ چوٹ کے خوف سے آہستہ آہستہ جوتا مارتے تھے لیکن امرا کو اس سے تسکین نہ تھی جوتے کی ہلکی ضرب کھجلی کو تیز کرتی تھی۔ البتہ جچے تلے ہاتھ اطمینان اور آرام کا باعث ہوتے تھے۔ مجبوراً غربا نے بھی ہاتھ گھما گھما کر مارنا شروع کیا۔ ہر ضرب کاری پر امرا کی زبان سے بے ساختہ آہا نکل جاتا تھا۔ یہ انوکھی خدمت انجام دیتے دیتے اکثر اہلِ محلہ تھک گئے۔ یہ رحم ہؤا کہ رات نے آ کر کھجلی کو کم کر دیا اور لوگوں کو آرام مل گیا۔ تیسرے روز پھر وہی دورہ شروع ہوا اب تو اہلِ محلہ نے کفش کاری کے جتھے بنا دیئے۔ جب ایک جتھہ جُوتے مارتے تھک جائے تو دوسرا اسکی جگہ پر لگ جائے۔

جان کی طرح عزیز سمجھنے لگیں گے۔ اپنے عیش کو چھوڑ کر ملک کی آزادی کے جذبے سے سرشار ہو جائینگے اور غیروں کا آلۂ کار بننے سے انکار کر دینگے۔ یاد رکھنا چاہیئے وطن دشمنی اور نخوت بھی دماغی مرض ہے۔ اس مرض کے علاج کے لئے بھی یہی تجویز بہترین ہوگی۔

چنانچہ اس بارہ میں بھی حکیم کے علاج کو موثر سمجھ کر اسی نسخہ پر عمل ہوا۔ دوائی کا دھواں ہوا میں مل کر سب سرداروں کے دماغ میں پہنچا۔ صبح ہوتے ہی سچ مچ سب کا سر کھجلانے لگا اور جوتے کھانے کو جی چاہنے لگا۔ ہر چند یہ حرکت بڑی ذلت آفریں تھی لیکن مرض کے ہاتھوں سب مجبور تھے۔ سب سرداروں نے کھلی ہوا میں کھڑے ہو کر عوام کے آگے سر کر کے کہا کہ برائے خدا انکی یہ خدمت انجام دیں۔ عوام نے ایک تو یہ قیاس کیا کہ ان کے دماغ چل گئے ہیں۔ دوسرے انہیں یہ جرات ہی نہ ہوتی تھی کہ وہ یہ کام کریں۔ ناچار مغرور سرداروں نے اپنے سر پر خود جوتے مارنے شروع کئے۔ سارا کنبے کا کنبہ اسی حال میں ہے کہ اپنے اپنے سروں پر جوتے مار رہے ہیں جب تک جوتا چلتا رہا کھجلی کو آرام رہا۔ جب ذرا ہاتھ رکا پھر کھجلی شروع ہو گئی۔ جب وہ اپنے سر پر اپنا جوتا چلاتے تھک گئے تو مجبور ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے لگے۔ گھر بھر میں جوتا اس طرح چل رہا ہے کہ چپاخ چپاخ کی آواز سے محلہ گونج اٹھا تھا۔ باپ بیٹے پر ہاتھ صاف کرتا تھا اور بیٹا باپ کی خبر لیتا تھا۔ بیٹی ماں کی خدمت کرتی تھی۔ ماں بیٹی سے

اظہارِ محبت کرتی تھی۔ ہر ایک ایک دوسرے کے غم میں شریک تھا عزیز عزیز کے ہاتھ سے جوتا کھا کر اور اُسے لگا کر محبت کا حق ادا کرتا تھا۔ یُوں ایک دوسرے کا غم کھاتے رات ہو گئی۔ سب تھک ہار کر سو گئے جوں ہی سورج نکلا پھر وہی مرض عود کر آئی۔ پھر لگے ایک دوسرے سے اظہارِ محبت کرنے لیکن دو گھنٹے کے اندر انکے بازو شل ہو گئے۔ سرمایہ داروں نے محلہ میں کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جو آفت ہمارے سر آن پڑی ہے وہ جُوتے سے ٹالو۔ عوام کو بڑے بڑے لالچ دیئے لیکن غربا کے ذہن میں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ وہ لالچ میں آکر خدمت کو تیار نہ تھے۔ بلکہ رحم اور خدمت کے سچے جذبہ سے متاثر ہو کر لاچار کفش کاری کرنے لگے۔ چوٹ کے خوف سے آہستہ آہستہ جوتا مارتے تھے لیکن امرا کو اس سے تسکین نہ تھی جوتے کی ہلکی ضرب کھجلی کو تیز کرتی تھی۔ البتہ بھچے تلے ہاتھ اطمینان اور آرام کا باعث ہوتے تھے۔ مجبوراً غربا نے بھی ہاتھ گھما گھما کر مارنا شروع کیا۔ ہر ضرب کاری پر امرا کی زبان سے بے ساختہ آہا نکل جاتا تھا۔ یہ انوکھی خدمت انجام دیتے دیتے اکثر اہلِ محلہ تھک گئے۔ یہ رحم ہؤا کہ رات نے آکر کھجلی کو کم کر دیا اور لوگوں کو آرام مل گیا۔ تیسرے روز پھر وہی دورہ شروع ہوا اب تو اہلِ محلہ نے کفش کاری کے جتھے بنا دیئے۔ جب ایک جتھہ جُوتے مارتے تھک جائے تو دوسرا اسکی جگہ پر لگ جائے۔

جُوتا جتنا زور سے پڑتا تھا اتنی ہی تسکین ہوتی تھی۔ اس لئے امرا ضرب کو موثر بنانے کیلئے ضرب کے وقت اوپر کو اچھلتے تھے۔ عوام کی کفش کاری کے ساتھ ان کی اچھل کود بھی جاری تھی۔

خدا خدا کر کے تنقیح دماغ کے چھ روز پورے ہو گئے۔ اور سب سرداروں کی طبیعتیں بحال ہو گئیں۔ اب عوام و خواص غلامی کی بیماری سے شفا پاکر نفع و نقصان کی سوچنے لگے۔ تب انہیں سمجھ آئی کہ غلامی سب سے بڑی لعنت ہے۔ یہ خود غرضی کی پیداوار ہے۔ اس لئے مشترکہ اغراض کے لئے انفرادی مفاد کی قربانی ہی آزادی کی حامل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ سب نے دل میں ٹھان لی کہ جو ہو سو ہو لیکن آزادی حاصل کرنے میں لمحہ بھر کی بھی کوتاہی نہ کرینگے۔

اندرا جب کوئی قوم آزادی پر آمادہ ہو جائے دنیا کی کون طاقت اس کو غلام بنا سکتی ہے۔ چین کی ساری کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں اہلِ چاند آزاد ہو گئے۔ اپنی آزادی حاصل کر کے دوسروں کی آزادی کی قدر کرنے لگے۔ دنیا نے ان اجیروں سے نجات پائی جو اجرت لے کر قوموں کو غلام بنانے کے لئے اہلِ چین کی فوج میں بھرتی ہو جاتے تھے۔

اندرما۔ کیا یہ افسانہ سچ ہوگا۔ کیا غلامی جوتے کھانے سے دور ہو سکتی ہے۔

فرحت۔ افسانہ حقیقت سے دُور ہی ہوتا ہے۔ میں کیونکر کہوں کہ افسانہ

میں کوئی حقیقت ہے لیکن غلامی تو اغیار کے جوتے کھانے کے مترادف ہے۔ جب قوموں کو غلامی میں جوتے کھاتے دیر ہو جاتی ہے تو آزادی کی ہوش اور عقل آنے لگتی ہے۔ تم باوجود آزاد تعلیم کے بھی مذہب کی خوبی اور سچائی کی قائل دکھائی دیتی ہو۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ مذہبی کتابوں میں بعض ایسے قصے موجود ہیں کہ جو لوگ اپنے غرور کے باعث خدا کے قانون سے باغی ہو گئے تھے۔ قدرت نے ان کے لئے جوتوں کی سزا تجویز کی تھی۔

نمرود کے متعلق بیان ہوا ہے کہ جب مختلف حیلوں سے اس نے دنیا کی دولت سمیٹ لی۔ اسکے خزانوں کے مقابلہ میں بڑے بڑے شاہ گدا نظر آنے لگے۔ اس کا سر غرور دولت کے نشے میں سرشار تھا۔ اسکی نگاہ میں کائنات کا خالق بھی ہیچ تھا۔ دولت اور اقتدار کی ترنگ میں وہ خدائی کا دعویٰ کرتا تھا۔ اس کے زرخرید غلام اور سچائی اور نیکی کے ازلی دشمن اس کے دعوے کے سامنے جھک جاتے تھے اس نے جنت اور دوزخ کا نقشہ یوں دکھایا کہ اپنے محلات کے گرد باغات بنائے۔ اسکے غلام اور قوم کے امرا جنت میں لطف اندوز ہوتے تھے۔ مزدور اور کسان شہر اور دیہات میں دوزخ کا دکھ اٹھاتے تھے۔ جب اس شخص کی انانیت حد سے بڑھ گئی تو ایک پشۂ خس اس کی ناک میں گھس گیا۔ اور دماغ کو چاٹنے لگا جس سے اسے بجلی

ہوتی تھی اور اپنے ملازموں سے اپنے سر پر جُوتے پٹواتا تھا تو دم بھر اسے آرام آتا تھا ورنہ جان بے آرام رہتی تھی۔

ممکن ہے یہ مذہبی روایت تمثیلی رنگ میں ہو۔ میرے بیان کردہ افسانے کو بھی تمثیلی رنگ میں قیاس کرکے یُوں سمجھ لو کہ غلام قومیں جُوتے کھاکر آزاد ہوتی ہیں اس طرح اسکی سچائی کو قبول کرو۔

اندرما خاموش ہوگئی اور فرحت رخصت لیکر چلا آیا۔

فرحت اور محسن آج دن کے وقت ملنے گئے۔ اندرما نے تازہ اخبار اٹھاتے ہوئے کہا بمبئی میں یہ بربریت کا مظاہرہ کیا جانے کب تک رہے "اسلام خطرے میں اور ہندو مذہب خطرے میں" کی یہ سرگوشیاں کہیں ختم ہوں تو مخلوق کو کچھ امن میسر آئے۔

فرحت نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ابھی تو امن کے آثار نہیں اس وقت تک تو مذہب کے نام پر تباہی جاری ہے۔

محسن نے گفتگو کا رخ بدلنے کے لئے کہا۔ اندرما قاضی کی طرح شہر کے اندیشے میں رہنا مناسب نہیں۔ یہ بتاؤ کہ دن کو تمہاری مصروفیت کی کیا صُورت ہے۔ کہیں فسادات کے فکر میں مبتلا تو نہیں رہتیں۔

اندرما فکر کے سوا کیا چارۂ کار ہے اور رہنے والی بھی اس ملک کی

ہوں جہاں بقول آپ کے حوادث پہ مرد عورتوں کی طرح رو دیتے ہیں اور آہنی عزم لے کر اٹھنے کی بجائے ارادوں کو آنسوؤں میں بہا دیتے ہیں۔

محسن۔ تلخ خیالات کو چھوڑو اندرما! (فرحت کو مخاطب کر کے محسن نے کہا) کیا کسی کھیل کا انتظام نہیں ہو سکتا تاکہ دن میں طبیعت کسی شغل میں لگی رہے

فرحت۔ میں کل تک سوچ کر کوئی بہتر صورت پیدا کرنے کی کوشش کروں گا بشرطیکہ آج کی رات مجھے داستان گوئی سے معافی مل جائے

اندرما۔ مگر کھیل مہیا کرنے کے لئے یہ اہتمام کیا ہے بیسیوں کھیلیں ہیں جن میں انسان دن بھر مصروف رہ سکتا ہے۔

فرحت۔ کھیل ایسی ہونی چاہئے جس سے شغل کے ساتھ تعلیم بھی ہو۔

اندرما۔ یہ صورت ممکن ہو سکے تو مجھے خوشی ہوگی اور (مسکرا کر کہا) آپکی پہلے سے بھی زیادہ احسانمندی۔

فرحت۔ تمہاری صحتیابی میری مساعی کا بہترین معاوضہ ہے۔ تم نے کسی کی احسانمندی کیلئے زخم نہیں اٹھائے تو تمہاری خدمت میری سعادت ہے

محسن نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ان تکلف کی باتوں سے کیا فائدہ۔ ہمیں کل تک کسی ایسی کھیل کا انتظام کرنا چاہئے جو بیکاری کی بیماری سے نجات دلا سکے۔ اور ان کا خیال بے ضرورت شہر کے فساد کی طرف رجوع نہ ہو۔ بہرحال اندرما ہم دونوں کل کوئی نہ کوئی انتظام کر کے لوٹیں گے

اندرمانے کہا لیکن ان کے مشاغل کے لئے رات کی دلچسپ کہانیاں قربان نہیں کی جانی چاہئیں فرحت! اندرمانے فرحت کی طرف جھکی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

فرحت نے کہا۔ بہت اچھا اندرما! تمہاری دلچسپیوں میں فرق نہ آئیگا۔

سیر

اس وقت فرحت اور محسن دونوں باہر چلے گئے اور جاتے ہوئے نرس سے ملے۔ اس نے اطمینان دلایا کہ زخم خلاف توقع جلد جلد بھر رہے ہیں۔ اگر اندرما شام کو سمندر کی سیر کے لئے بھی جانا چاہے تو اجازت ہو سکتی ہے۔ وہ پھر واپس لوٹ آئے اور اندرما سے کہا کہ تمہاری محبوب تفریح یعنی سمندر کی سیر کی اجازت ہوگئی ہے۔ شام کو موٹر لے کر ہم آئیں گے اور کشتی میں سوار ہو کر نزدیک پانیوں کی سیر کو جائینگے۔ اس گوشہ نشینی کے بعد کھلی ہوا ضرور مفید ہوگی۔ چنانچہ وہ شام کو موٹر لے آئے۔

اندرما کئی دن کے بعد ساحل سمندر پر گئی تھی۔ ساحل پر حسن تھا لیکن حسن پرست نہ تھے کیونکہ شہر میں آمد و رفت خطرناک تھی۔ وہ آہستہ سے کشتی پر بٹھا دی گئی۔ اس کے ریشم سے نرم بال شانوں پر بکھرے پڑے تھے۔ وہ کمزور تھی لیکن نرگس بیمار کی طرح آنکھوں سے ہر طرف نور برسا رہی تھی۔ ہوا کے جان بخش جھونکے آنکھوں میں تو نیند سی لا رہے تھے۔ اس لئے

سرور سا برستا تھا جس سے سوئی ہوئی محبت جاگنے کے لئے کروٹ لے رہی تھی۔ خوبصورت اندرما پری کی طرح کشتی میں مخمل کے نرم تکیوں کے سہارے لیٹی تھی۔

اندرما نے فرحت کو محبت اور پیار کی نظر سے دیکھا۔ مگر اس نے حجاب مآب دوشیزہ کی طرح نگاہیں نیچی کرلیں یا تابِ نظارہ نہ تھی۔ یا محبت کا جواب محبت کی نظر سے نہ دینا چاہتا تھا۔ محسن کو اپنی موجودگی پر افسوس ہوا اسے معلوم تھا کہ محبت تخلیہ چاہتی ہے۔ شاید میری موجودگی کے باعث آنکھیں دوچار کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اس نے منہ پھیر لیا تاکہ موجودگی میں تخلیہ ہوجائے۔ ایسے پرسکون موسم میں سمندر کی سیر آرزوؤں کا طوفان پیدا کردیتی ہے۔ اندرما کے دل میں تو محبت موجزن تھی لیکن فرحت یا تو جذبۂ عشق سے ناآشنا تھا یا ہوشیاری سے جذباتِ محبت پر سکون کی مہر لگائے بیٹھا تھا۔ محسن نظر چرا چرا کر دیکھتا تھا تاکہ نگاہوں کو محبت کے اشاروں میں مصروف دیکھے لیکن ہر بار اسے مایوسی ہوتی تھی۔ کیونکہ فرحت افقِ مغرب کے نظارے میں مصروف تھا۔ ساتھ ہی اس بات کی برابر احتیاط رکھتا تھا کہ اندرما کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ ذرا سے ہچکولے پر چونک کر اندرما کی طرف دیکھتا تھا کہ کہیں اسے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ فرحت اندرما اور محسن دونوں کے لئے معما تھا۔ اسکے کردار اور گفتار میں بے پایاں محبت تھی لیکن چہرہ پیار کی علامات سے خالی

فرحت کے طرزِ عمل نے محسن کا سمندِ فکر اسے بغداد کی وادیِ محبت میں لے گیا۔ شہزادی نیلوفر کی محبت کا میں یہ جواب دے سکتا ہوں! میرا ساتھی شریف گدھا ہے جس میں شرافت بے شک ہے لیکن وہ شریف لڑکی کی طرف مناسب توجہ نہیں دیتا۔

چاند نے روشن ہو کر دنیا کو روشن کر دیا۔ سمندر کی سطح پر چاندی کا پانی بھر گیا۔ موسم نے ہزار بہاریں لٹا کر عالم کو پُر بہار کر دیا۔ کیا عجب سماں تھا کیا اچھی سیر تھی۔ فرحت نے گردوپیش سے متاثر ہو کر کہا اندرما کیا خوب وقت ہے اس نے جواب کے لئے محبت سے اندرما کی طرف دیکھا۔ اندرما نے اسکی نگاہِ محبت کا دل سے استقبال کیا۔ اس نے اب محسوس کیا کہ واقعی یہ زندگی کا شیریں لمحہ اور لطیف آرزوؤں کی پرورش کا بہترین وقت ہے۔ وقت اور خیال کے خوشگوار تغیر نے اندرما کی طبیعت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ وہ خوشی سے سنبھل کر بیٹھ گئی۔ محبت میں امید کامیابی کتنی جلد نہال کر دیتی ہے۔ اس کے زرد چہرے پر گلاب کی سی سرخی آگئی۔

اندرما نے کہا ایسے خوشگوار موسم کا نظارہ اور ایسی سعید ساعت مشکل سے ملتی ہے۔

اندرما اور فرحت نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ شریف لڑکی کی خوشی کی انتہا نہ رہی اس نے محسوس کیا کہ فرحت اسکی صحت کی بحالی پر بیحد مسرور ہے

واقعی فرحت کو اندرما کی صحت کا دن رات خیال رہتا تھا اسکی طبیعت میں ہلکا سا تغیر اسکے دل پر اثر انداز ہوتا تھا۔ اس وقت فرحت اندرما کو دیکھکر خوش تھا اور اندرما فرحت کو دیکھ کر مسرور تھی۔ وہ دونوں ہمدردی کے بجرے میں بیٹھ کر محبت کے سمندر کی سیر کر رہے تھے۔ اس وقت دونوں کا دل شہر کے اندیشے سے خالی تھا۔ صرف ایک دوسرے کے خیال کی رو میں بہے جا رہے تھے۔ دونوں کو اگر سوچ تھی تو یہ کہ ایک دوسرے کی خوشیوں میں کیونکر اضافہ کر سکتے ہیں۔

محسن دونوں کو مسرور دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اور شریف گدھے کی پھبتی جو اس نے وضع کی تھی اس میں ترمیم کرنا چاہی لیکن وہ ایسا نہ کر سکا کیونکہ وہ اب سوچنے لگا کہ یہ توجہ تو بھائی بہن میں بھی ہوتی ہے یا اس کو شریفانہ تلطف کہا جا سکتا ہے۔ نگاہِ لطف کو پیار کی نظر نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال محسن ان کو خوش دیکھ کر خوش تھا لیکن فرحت کے طرزِ عمل سے مطمئن نہ تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ اندرما کم از کم صحت کی کامل بحالی تک غلط فہمی کی اسی جنت میں بہے کہیں مایوس محبت کی طرح غم کے گڑھے میں نہ گر جائے۔

غرض اندرما اور فرحت شاداں و فرحاں واپس لوٹے اور محسن خوشی اور فکر کے ملے جلے جذبات لیکر ہسپتال میں ہمراہ آیا۔ چونکہ سیر میں دیر ہو گئی تھی اس لئے فرحت کو آج داستان گوئی سے معافی مل گئی لیکن اندرما نے اسے رات کو

محسن کے ہمراہ آنے کی تاکید کردی۔

حسبِ معمول فرحت رات کے وقت آیا اور ایک نئی داستان یوں آغاز کی۔

سائنس دان کی کہانی

شہر کلکتہ کے ایک سائنسدان ڈاکٹر بوس کی ایک کم علم امیر مسٹر گھوش سے پرانی ملاقات تھی۔ یہ ملاقات عرصہ سے گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ گھوش بوس کو ہمیشہ بند کمرے میں مختلف تجربوں میں مصروف دیکھ کر گھبرا اٹھتا تھا اور کہتا تھا یار وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔ اور عمر کیوں کھو رہے ہو۔ یہ دنیا ہزار حسن کی جلوہ گاہ ہے چلو سیرِ دریا کا لطف اٹھائیں۔ کہیں پانی کے آئینے [illegible] وئی شاخوں کا اپنی نزاکت و رعنائی کو دیکھ کر جھوم جانا دیکھیں کبھی کرنوں کو لہروں میں کھیلتے دیکھیں۔ کبھی چاند [illegible] چلتا ملاحظہ کریں۔ کبھی خورکو سرو کی تانیں [illegible] سنیں۔ فرشِ زمین کو برسات میں سبز بانات [illegible] ہے دیکھیں۔ محبوب کے آنسوؤں میں رنگِ محبت جھلکتا نظر آئے۔ کبھی اسکی خشمگین نگاہیں آتش باری کرتی دکھائی دیں۔ کوئل کی کوکو پپیا کی پی پی سن کر آتش بجاں عاشق کی طرح تلملائیں۔ خدا کی قسم، بوس ایسے ہزار ہا نظر آرا مناظر کو چھوڑ کر تم دھوئیں کے بادلوں میں کہاں چھپے رہتے ہو۔

ایک دن مسٹر بوس نے گھوش کی اس ہی قسم کی رنگین بیانی سُن کر آنکھوں سے عینک اونچی کر کے اسکی طرف دیکھا اور کہا۔ دوست نگاہ ظاہر بین کے نظارے بیشک کیف زا اور فرحت افزا ہیں۔ اگر تمہاری آنکھوں پر اپنی عینک لگا دوں تو تم میری طرح دھوئیں کے انہی بادلوں میں چھپے رہنے کو پسند کرو۔

گھوش۔ مَیں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔

بوس۔ اگر کل اسی وقت یہاں تشریف لے آؤ تو مَیں تمہیں سمجھا دونگا۔

دوسرے دن گھوش وقت مقررہ پر آگیا۔ مسٹر بوس اس کا ہاتھ تھامے سائنس روم میں داخل ہوا۔ پہلے اُس نے ایک سوئی سے اپنے جسم کا قطرہ خُون نکالا اور اسے ایک شیشہ کی پلیٹ پر لگا دیا۔ اسی طرح اُس نے گھوش کے خُون کی بوند نکالی جو دوسری پلیٹ پر لگا دی اور کہا دوست اسکو اچھی طرح دیکھو کچھ نظر آئے تو بتاؤ۔ گھوش نے قطرۂ خون کو خُوب غور سے دیکھا کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔

مسٹر بوس نے خود ہی کہا کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ گھوش نے جواب دیا بیشک کچھ نظر نہیں آتا۔

بہت ٹھیک بوس نے کہا۔ یہ عینک لگاؤ اب بتاؤ کیا صورتِ حال ہے۔

گھوش نے عینک لگا کر دیکھا تو چونک اُٹھا اور کہا باپ رے باپ اس قطرۂ خون میں تو لاکھوں کیڑے موجود ہیں۔ یہ تو جانداروں کا ایک جہان ہے۔ مسٹر بوس میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ میری نظر قطرۂ خون پر ہے یا کسی دوسری چیز پر۔

مسٹر بوس نے گھوش کی آنکھوں سے عینک ہٹالی۔ اور کہا گھوش اطمینان کرلو یہ قطرۂ خون ہی ہے جس کو تم دیکھ رہے ہو۔ میں نے یہ عینک اس لئے ہٹالی ہے تاکہ آئندہ تم کو عجائبات دیکھ کر زحمتِ افکار اُٹھانا نہ پڑے۔ آؤ شیشے کی اس پلیٹ کو آلات کے سامنے رکھ کر دیکھو تم مجھے صورتِ حال بتاتے جانا میں نوٹ کرتا جاؤں گا لو آؤ آلات کی مدد سے قطرۂ خون کو دیکھو۔

گھوش نے مسٹر بوس کے حکم کی تعمیل کی۔ ارے ارے کہہ کر آنکھیں آلات سے ہٹالیں اور کہنے لگا مسٹر بوس یہ کیا قیامت ہے اس میں تو شہر اور بستیاں آباد ہیں

مسٹر بوس نے کہا ہیں تو سہی لیکن یہ تو بتاؤ اس میں کیا ہو رہا ہے انتظام ملکی کا کیا حال ہے معاشرتی صورتِ حال کیا ہے

گھوش نے پھر ان معجز نما آلات پر آنکھیں لگا کر دیکھا اور کہا مسٹر بوس مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں ہوا باز کی طرح اونچے آسمان سے زمین کو دیکھ رہا ہوں۔ ننھے ننھے درخت، چھوٹی چھوٹی عمارتیں لکیر کی طرح سڑکیں دکھائی

دیتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قد کے آدمی کاروبار میں مصروف ہیں۔ اس سے زیادہ تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ ایک ہی ایسا شہر اور بستی نہیں۔ بلکہ دور و دراز جہاں تک میری نظر جاتی ہے۔ اس طرح کے شہر اور قصبات دکھائی دیتے ہیں۔

مسٹر بوس نے آلات کا پیچ ذرا اور کس دیا اور کہا دوست اب دیکھ کر بتاؤ کچھ وسعتِ نظر پیدا ہوئی یا نہیں۔

گھوش۔ ارے بوس اب تو ہر گلی بازار یوں نظر آتا ہے گویا میں کسی اونچے مکان کی چھت پر کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہوں میری نظر کے سامنے جو شہر ہے اسے عروس البلاد کہا جا سکتا ہے۔ سر بفلک عمارتیں، صاف ستھری سڑکیں، باغات اور نہریں ہر طرف جلوہ افروز ہیں۔ ہر چوک میں سنتری پہرہ دے رہا ہے۔ صرافے کے بازار سونے چاندی سے بھرے ہیں۔ شہر کے گرد بڑی نہر زلفوں کی طرح پیچ و خم کھاتی گئی ہے۔ سایہ دار درخت ہر قسم کے پھل پھول سے لدی ڈالیاں آنکھوں میں باغ و بہار پیدا کر رہے ہیں۔ اس نہر پر درختوں کے سائے میں حسین مصروفِ ناؤ و نوش ہیں۔ نئے نئے قسم کے ساز بج رہے ہیں مغنیوں کے راگ تو نہیں سن سکتا مگر آنکھوں کے اشاروں سے قیامتیں بپا کر رہی ہیں ان کے ناچ سے جہان گردش میں ہے۔ مسٹر بوس تم نے مجھے کس جہان میں لا پھینکا ہے۔

مسٹر بوس نے جواب دیا یہ وہی قطرۂ خون ہے جو میرے جسم سے نکلا تھا
گموش نے کہا۔ دیکھو بوس دولہا دلہن بیاہ کر لا رہا ہے۔ خود گھوڑے پر ہے اور دلہن رتھ پر سوار ہے۔ ریشمی رنگدار کپڑے لٹک رہے ہیں۔ وہ گھوڑا بدکا دولہا زمین پر گر گیا۔ لوگ دوڑے آئے کہ کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔ دلہن نے بیتاب ہوکر باہر جھانکا۔ حسن کا آفتاب تھا جو نکل آیا۔ خیر بچی دولہا سلامت ہے۔ پھر سوار ہو گیا ہے۔ دلہن کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ چہرہ پردوں میں چھپا لیا آفتاب حسن غروب ہو گیا۔ لو وہ پولیس کے افسر آ گئے تفتیش ہو رہی ہے کہ گھوڑا کسی کی شرارت سے تو نہیں بدکا۔ معلوم ہوا ہے کہ کسی کم سن بچّے نے پٹاخہ چلا دیا تھا پولیس چلی گئی ہے۔ مسٹر بوس اس شہر کا خوب انتظام ہے۔ گھوڑے گاڑیاں ایک طرف جا رہی ہیں۔ پیدل کے لئے الگ رستہ مقرر ہے۔ آوارہ بچّوں کو پولیس کیوں پکڑ رہی ہے۔ انہیں کہاں لے جا رہی ہے۔ ہاں یہ سکول کا پھاٹک ہے۔ پولیس بچوں کو اندر لے گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے کے وقت بچّوں کو آوارہ پھرنے کی اجازت نہیں۔ ساتھ کے باغ میں سب خوش وضع بوڑھے جمع ہیں۔ بال سفید مگر چہرہ کا رنگ سرخ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خاص عمر کے بعد سب کو بڑھاپے کی پنشن مل جاتی ہے اور وہ باغات میں بہترین عمارتوں میں آ کر بسر کرتے ہیں۔ اس شہر میں بھکیاری اور کمزور دکھائی نہیں دیتے۔ یہ سفید فرغل پہنے شاید ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے ایک کھانسنے والے

کو روک لیا۔ وہ اس کے پھیپھڑے کا بازار میں امتحان کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس کو چیٹ لکھ دی ہے۔ لو پولیس افسر اس کو بھی ہمراہ لے چلا ہے۔ کہاں جائے گا۔ یہ لو ہسپتال میں لے گیا۔

مسٹر بوس ایسا انتظام ہمارے وہم میں بھی نہیں آتا۔ اس شہر میں نہ شراب خانہ ہے نہ چانڈو خانہ مکانوں کے اندر آنگن ایسے صاف ستھرے ہیں کہ کوئی کہے کہ ان میں بہشت کے باشندے رہتے ہیں۔ لوگوں کے لباس بے داغ منہ ہاتھ گنگا جل سے دھوئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ہر گھر سرگ کا آباد حصہ ہے صحن صحن چمن ہے۔ دیواروں پر نہایت خوشنما پھول کی سبز بیلیں چڑھی ہیں۔ یہ شہر کا اندرونی حصہ ہے۔ بیرونی حصہ تو سبحان اللہ دنیا کی بہترین سیرگاہ ہے۔ ہر طرف نرم نازک شاخیں مست ہو کر جھوم رہی ہیں۔

بوس نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ یہاں کے دیہات کی کیا کیفیت ہے۔

گھوش نے کہا ذرا ٹھہرو! ہاں یہ شہر کے قریب ایک گاؤں ہے۔ کیا خوب بستی ہے نہ ارد گرد کوڑا کرکٹ نہ بستی کے اندر غلاظت۔ لہلہاتی کھیتیاں خوش پوش محنتی دہقان۔ تندرست و توانا بیل ہیں۔ سبز کھیتوں میں رنگین مور ہر طرف ناچتے ہیں اور ہرن ادھر اُدھر دوڑتے ہیں۔ ہر طرف حسنِ خداداد کی بہتات ہے۔ سبزہ کا فرش بچھا ہے۔ سبز درختوں پر خوبصورت طوطے اڑتے ہیں ڈاکٹر بوس میری نظروں کے پرے خوشنما پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ دوست اٹھیئے

کی پلیٹ کو ذرا سرکا نہیں دیتے

بہت خوب ڈاکٹر بوس نے کہا

گھوش۔ ارے رے یہ تو تم نے زیادہ سرکا دی۔ اب تو نظر ساحل سمندر پر جا ٹھہری ہے۔ کلکتہ سے دس گنا بڑا بندرگاہ ہے۔ یہاں تجارت سے لدے ہزاروں جہاز جا رہے ہیں۔ اور آ رہے ہیں عجب چہل پہل ہے سمندر بھی بلا خیز ہے۔ بڑی بڑی موجیں ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔ جہاز بھی کیسے مضبوط سمندر کی چھاتی کو چیر کر جا رہے ہیں۔ بڑا ہی پُر لطف نظارہ ہے ولایت وا یت کے مسافر آ رہے ہیں۔ بہت لوگ دوسرے ملکوں کو جا رہے ہیں عجب بھیڑ بھاڑ ہے۔

ڈاکٹر بوس نے آلات کا پیچ اور کس دیا۔

گھوش۔ ٹھیک اب پہاڑ سامنے ہے۔ کیسا سرسبز ہے۔ اس پہاڑ کے لوگ کیسے خوبصورت ہیں۔ بادل دھوئیں کی طرح امنڈ رہے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں ٹیلے پر چڑھ کر پہاڑی گیت گاتی ہوئی جھوم جھوم جاتی ہیں نوجوان گھنے درختوں میں دراز ہو کر بنسری بجاتے معلوم ہوتے ہیں۔ دامنِ کوہ میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے۔ چھوٹے بڑے نالے بہہ رہے ہیں۔ پانی پتھروں سے سر ٹپکتا جا رہا ہے

گھوش نے آلات سے نظر ہٹا کر کہا۔ ڈاکٹر دوست یہ تو تم نے

بڑا کمال کر دیا۔ ایک قطرے میں جہاں دکھا دیا۔

ڈاکٹر۔ اس جہاں کا پروردگار تو میں نہیں لیکن منتظم میں ہوں۔ جس جہان کے منتظم تم ہو اس کا بھی نظارہ دیکھو۔ اس پلیٹ کو اس جگہ رکھو جہاں یہ پلیٹ رکھی ہے۔ ہاں اسکو اٹھا کر آلات پر رکھ دو۔ اس پہ تمہارا قطرۂ خون ہے۔

گھوش نے ایسا ہی کیا۔

گھوش نے جونہی آلات کے ذریعے اپنے قطرۂ خون کو دیکھا بچھو کے ڈسے ہوئے کی طرح تڑپ اٹھا اور کہا ڈاکٹر لوس یہ کیا مذاق ہے۔

ڈاکٹر لوس نے مسکرا کر کہا کیوں مذاق کی کیا بات ہوئی۔

گھوش نے پھر آلات کے ذریعہ دیکھ کر کہا۔ یہاں تو قدرتی جنگلوں میں وحشی ننگے ناچتے ہیں۔ نہ کوئی شہر نہ دکان۔ غاریں ہیں یا خشک پہاڑ ہیں۔ سانپ درختوں سے لٹکتے ہیں۔ شیر بھیلے بھاگے پھرتے ہیں۔ سانپ پرندوں کو کھاتے ہیں۔ پرندے سانپوں کو کھاتے ہیں۔ وہ دور ہزاروں ہاتھی اودھم مچا رہے ہیں۔ سونڈوں سے ایک دوسرے کو مار کر ہلاک کر رہے ہیں۔ جنگل کے وحشیوں کو کوئی تمیز نہیں۔ وہ عورتوں سے فحش مذاق کرتے ہیں۔ عورتیں انہیں صلواتیں سناتی معلوم ہوتی ہیں۔ عجب دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرد اور عورتیں پھلوں پر گذارہ کرتے ہیں۔

چشموں سے پانی پی آتے ہیں۔ انہیں کسی بات کا سلیقہ نہیں۔ کچھ بیکار بیٹھے ہیں کچھ لیٹے ہیں۔ کسی چیز کے دھوئیں اڑا رہے ہیں۔ کچھ ڈھولک کو پیٹ رہے ہیں۔ کچھ پیٹ بجا رہے ہیں۔

گھوش نے نظر ہٹا کر کہا دوست مجھے تو اس نظارہ سے وحشت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر۔ نہیں آلات کو ذرا اور سرکا کر دیکھتے ہیں۔ شاید کوئی بہتر مقام نظر آ جائے۔

چنانچہ ڈاکٹر نے آلات کا پیچ اور کس دیا۔

گھوش نے پھر دیکھ کر پکارا یہ تو بد سے بدتر ہے۔ یہاں تو انسان بندروں کی طرح قلابازیاں کھاتے ہیں۔ بچوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ چڑاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دھول اور چپت جماتے ہیں۔ ہر طرف گھنے جنگل ہیں۔ کھیت کیاری کا نام ونشان نہیں۔ بستی اور شہر کا کہیں پتہ نہیں۔ خودرو پودوں سے زمین ڈھکی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر بوس میں دیکھوں تو کیا دیکھوں۔ تہذیب سے عاری لوگ میری نگاہوں کیلئے خار بن رہے ہیں۔ ان ملنگوں نے ساری کائنات کو بدتہذیبی کے باعث دوزخ بنا رکھا ہے۔ دیکھو پایاب پانیوں میں ایک گروہ مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ پانی کو خوب گدلاتا ہے اور اس طرح پانی کیچڑ کو ایک کر کے مچھلیوں کو اندھا کرتا ہے اور انہیں پکڑ کر کچی کھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر بوس نے پیچ کو اور کس دیا۔

گھوش۔ ایلو ساحلِ سمندر آگیا۔ یہاں بھی ننگ دھڑنگ لوگ سیپ جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ بڑے بڑے سیپ ایک دوسرے کی آنکھوں پر مارتے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ یہاں جہاز اور کشتی کا وجود کہاں پرانے پرانے درختوں کے موٹے موٹے ڈال پانی میں بہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ بندروں کی طرح ان پر بیٹھے کھیل تماشے کرتے ہیں۔

گھوش نے آلات سے آنکھیں ہٹا کر کہا دوست مجھے تو اس روح فرسا نظارے سے گھن آتی ہے۔

ڈاکٹر بوس نے عینک آنکھوں سے اونچی اُٹھاتے ہوئے کہا۔

گھوش گھن تو آتی ہے مگر اس کائنات کا منتظم کون ہے۔ وہ شخص جو دیکھ کر کہتا ہے کہ مجھے اسکے نظارے سے گھن آتی ہے۔ ان انسانوں کے گھناؤنے اطوار کے ذمہ دار تم ہو۔ تم امیر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ لاابالی زندگی بسر کی اگر لوگوں کی سعی و عمل سے تہذیب و ترقی کے جملہ سامان تمہارے ارد گرد جمع نہ ہوتے تو تم بھی تہذیب سے اسی طرح عاری ننگے دھڑنگے پھرتے۔ تمہارے ارادے اور خون میں ترقی کی خواہش اور اس کے لئے حرکت موجود نہیں۔ تمہارے ظاہری جمود کا نتیجہ یہ ہے کہ تمہارے خُون کے قطروں میں جو کائنات پرورش پا رہی ہے وہ بھی عمدہ ارادے اور ترقی کی خواہش سے محروم ہے۔

جس حال میں پیدا ہوئی اسی حال میں بسر اوقات کر رہی ہے۔

گھوش، تم میرے دیرینہ ملاقاتی ہو، تمہاری اصلاح میرا فرض تھا۔ میں تمہاری کوتاہیوں سے غافل نہ تھا۔ لیکن میری زندگی میں فرصت کے لمحے بہت کم آتے ہیں۔ میں اس سے قبل تمہارے حال کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ اب جب کہ میں اپنے بعض تجربوں میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ وقت آ گیا ہے کہ میں تمہیں تمہاری اصلاح کی طرف توجہ دلاؤں۔ میری مصروف زندگی سے تم نے اپنے لئے کوئی سبق نہ لیا۔ اپنی بے مصرف زندگی کو اپنے قطرۂ خون کی بندر نما مخلوق کی طرح کھیل تماشے میں بسر کرتے رہے۔ انسان کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ وہ خود اپنی اصلاح کرے اور گرد و پیش کی مخلوق کی بہتری کا ضامن ہو اور کائنات کی وسعت کو دیکھ کر خدا کی حمد و ثنا کرے۔

اپنے تجربے اور تمہارے مشاہدے کی بنا پر تمہیں کچھ اور باتیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک اور قطرۂ خون دو۔ لو اس خون آلود شیشے کی پلیٹ کو انہی آلات کے سامنے رکھ دو۔ رکھ دیا بہت خوب کیا۔ لو اب میرے جسم کا تازہ خون کا قطرہ لو اور اسے اپنے قطرۂ خون میں جلدی سے ملا دو اور جو نظر آئے وہ مجھے بتاتے جاؤ۔

گھوش نے سٹربوس کے حکم کی تعمیل کی اور دونوں قطرات خون کو ملا کر انہی آلات کے ذریعے دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر بوس گھوش نے پکار کر کہا۔

پیادے اور سوار قطار اندر قطار ہزار بدہزار کھڑے ہیں۔ ہوائی جہاز سر پر منڈلا رہے ہیں۔ اول درجہ کی یورپین فوج سے بہتر ساز و سامان سے آراستہ ہو کر یہ فوج کہاں جا رہی ہے۔ ہاں یہ تو تمہارے قطرۂ خون کی دنیا ہے۔ یہاں ہر طرف چھاؤنی چھائی ہے۔ علم ہوائیں لہرا رہے ہیں۔ افسر گھوڑوں اور موٹر گاڑیوں میں بیٹھ کر ادھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر چکر کاٹ رہے ہیں۔ مگر معلوم نہیں کہاں چڑھائی کے ارادے ہیں۔

مسٹر بوس نے پیچ کو اور کس دیا۔

بوس یہ تو میرے خون کی کائنات پر دھاوا ہے۔ ان میں لڑائی کی تاب کہاں بیچارے ناک رگڑ رہے ہیں۔ ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ بوس تمہارے خون کی دنیا میرے خون کی کائنات کو مار مار کر کپڑے اوڑھا رہی ہیں۔ پہلی دفعہ پہننے کے باعث یہ باران کی طبیعت پر گراں ہے وہ اتار کر پھر قدرتی لباس میں ہونا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی ہر ایسی کوشش پر کوڑے پڑتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شیر اور ہاتھی بھی اس آفتِ ناگہانی سے ڈر گئے ہیں۔ توپ اور بندوق کے گولی گولوں کی تاب نہ لا کر ہاتھی جنگلوں کے اندرونی حصہ میں گھس گئے ہیں۔ شیر پہاڑوں پر چڑھ گئے ہیں۔

یہ لو انہوں نے سب کے ہاتھ میں کلہاڑیاں اور درانتیاں دے دیں۔ سب جنگل کو کاٹ کاٹ کر صاف کرنے لگے۔ جب کبھی کام سے جی چراتے ہیں

تو جھونپڑوں پر ونڈے کھلتے ہیں۔ وہ لباس سے سخت تنگ ہیں۔ کام کرتے کرتے جسم کو اس طرح سکیڑتے تھے گویا کپڑے کانٹوں کا لباس ہیں۔

ساحلِ سمندر پر بھی جبریہ تہذیب سکھائی جا رہی ہے۔ درختوں کو چیرنے کا کام سکھایا جا رہا ہے تاکہ کشتی بنانے میں آسانی ہو۔ آوارہ بچوں کو جمع کر کے ایک بوڑھے مدرس کے سپرد کر دیا گیا ہے تاکہ آرام سے ایک جگہ بیٹھنا آ جائے کچھ لوگ ہیں جن سے جھونپڑیاں بنانے کا کام لیا جا رہا ہے ساتھ ہی ساتھ سڑکیں درست کرنے کا کام بھی شروع ہے گھاس کو کاٹ کر گٹھڑیاں باندھی جا رہی ہیں۔

ڈاکٹر بوس تیرے قطرۂ خون کی مہذّب دنیا نے میرے قطرۂ خون کی غیر مہذب آبادی کو معاشرت کے ابتدائی اصول سکھانے شروع کر دیئے ہیں۔

اتنے میں ایک جوگی نے کھڑکی سے اندر جھانک کر صدا دی۔ نارائن راضی رکھے بابا۔

ڈاکٹر بوس نے آنکھوں سے عینک ہٹا کر اُسے دیکھا اور اندر آ جانے کو کہا۔ جوگی اندر آ کر سٹول پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے پانچ روپے کا نوٹ پیش کر کے کہا ہمیں ایک قطرۂ خون کی ضرورت ہے اسکے لئے یہ حقیر نذرانہ ہے۔

جوگی نے اطمینان سے کہا۔ سخی مجھے صرف آج کیلئے پانچ پیسوں کی ضرورت ہے۔ کاغذوں کی ضرورت نہیں۔ تم بلا معاوضہ قطرۂ خون لے سکتے ہو۔ مگر بتاؤ اس کا مصرف کیا ہے۔

ڈاکٹر نے کہا یہ تماشا آپ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ کا قطرۂ خون اس تماشہ کا ٹکٹ سمجھ لیا جائیگا۔

جوگی قطرۂ خون دے کر وہیں بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر نے جوگی کو بھی پہلے خون کی بوند میں ہزاروں جانوں کا مشاہدہ کرایا۔ پھر خون آلود پلیٹ کو حسبِ دستور آلات کے سامنے رکھ دیا۔ اور ڈاکٹر بوس نے کہا تو مسٹر گھوش اب صورتِ حال کو دیکھ کر بتاؤ۔ گھوش نے نگاہ کر کے کہا کہ ہزارہا جوگی درختوں کے سایہ اور دریا کے کنارے یادِ خدا میں مشغول ہیں۔ کوئی دھونی لگائے کوئی بھبھوت رمائے بیٹھا ہے۔ کوئی عالمِ بے خودی میں کوٹھے بلاتا آنکھیں مٹکاتا ناچتا ہے کوئی ہو حق ہو حق کہتا جٹوں کو ہوا میں پھیلاتا ہے۔ عام طور پر یہ لوگ صفائی پسند ہیں۔ جگہ جگہ معبد اور مندر بنے ہیں۔ پہاڑوں کی سرسبز بلندیاں ان کی دل پسند جائے رہائش ہیں۔ ہر پہاڑی پر سادھو کی کٹیا ہے۔ بھمال چمٹے بجائے اور بھجن گائے جاتے ہیں۔ آواز میں سن نہیں سکتا مگر اندازے سے قیاس کرتا ہوں کہ بھجن گائے جا رہے ہیں۔ کیونکہ لب کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ کوئی سورج پر نظر جمائے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہے۔ کوئی عمر آنکھیں بند کئے دل کی آنکھوں سے کیا کچھ دیکھ رہا ہے۔

ڈاکٹر بوس نے اسکے بعد کہا۔ گھوش اپنا او قطرۂ خون دو۔ تاکہ جوگی کے قطرۂ خون میں ملا دوں۔ اور تم پھر دیکھو بات کیا بنتی ہے

چنانچہ ڈاکٹر بوس نے گھوش کے خون کی ایک اور بوند لیکر جوگی کی خون آلود پلیٹ پر لگا دی۔

گھوش نے تلملا کر کہا ڈاکٹر غضب ہو گیا ننگوں کی بے پناہ فوج نے غریب جوگیوں پر حملہ کر دیا ہے۔ ان کے معبد اور مندر برباد کر دیئے ہیں۔ ان کی کٹیاؤں کو آگ لگا دی ہے جوگی اس آفتِ ناگہانی کی تاب نہ لا کر سر پر پاؤں رکھے بھاگ رہے ہیں۔ ڈاکٹر کچھ جتن کرو کسی طرح میرے خون کی وحشی آبادی سے ان کو مخلصی ملے۔ ان خدا رسیدہ لوگوں پر اس تہذیب سے عاری گروہ کو چھوڑ دینا مہا پاپ ہے۔ جوگی نے بھی اپنے قطرے کی دنیا میں یہ دردناک انقلاب دیکھا

اب ڈاکٹر بوس نے اپنا قطرہ خون نکال کر اس پلیٹ پر چپکا دیا اور تینوں خون ایک پلیٹ پر جمع ہو گئے۔

گھوش پیشِ نظر نظارہ کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے کہا۔ ڈاکٹر بوس تمہارے خون کی مخلوق مار پیٹ سے دونوں میں درمیان داری کر رہی ہے۔ وحشیوں سے جوگیوں کو نجات دلا رہی ہے۔ لو اب وحشی اور جوگی دونوں الگ الگ ہو گئے۔ بڑے بڑے موٹے سادھوؤں کی سانس دھونکنی کی طرح پھولی ہوئی ہے۔ بڑی پریشانی سے وحشیوں کے آمادۂ فساد گروہ کو دور کھڑے تکتے ہیں۔ اور امتنان و شکر کی نگاہ سے امن پسند نو وارد ان کو دیکھ رہے ہیں۔

لو اب با خدا بے کار جوگیوں اور آوارہ وحشیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہے۔ دونوں کو کام کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ کام میں باقاعدگی جوگی اور وحشی دونوں کیلئے مصیبت ہو رہی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس عذاب سے نجات مل جائے لیکن پیٹھ پر کوڑا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر بوس اس وقت بڑے بڑے اجتماع بھی ہو رہے ہیں جس میں جوگی اور وحشی پاس پاس کھڑے ایک شخص کی طرف متوجہ ہیں جو غالباً کچھ تقریر کر رہا ہے۔ کیونکہ اُس کے لب کھلتے اور بند ہوتے دیکھتا ہُوں۔ کبھی وہ ہاتھ اوپر کو اٹھاتا ہے کبھی گراتا ہے۔ کاش! ڈاکٹر بوس میں سن سکتا یہ کیا کہہ رہا ہے

ڈاکٹر بوس نے کہا سر دست میں آواز کو آلات میں جذب نہیں کر سکا۔ اس بارے میں مجھے صرف درختوں اور پودوں میں کامیابی ہوئی ہے۔ بہر حال حالات سے معاملات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ ضرور جوگیوں اور وحشیوں کی اس بیکار فوج کو کام کر کے کھانے اور دنیا میں انفرادی اور قومی ترقی کے لئے جان لڑانے کی تلقین کر رہا ہوگا۔ ہندوستان بھی دو مصیبتوں میں مبتلا ہے۔ ایک دنیا سے غیر حاضر جوگیوں اور فقیروں کا گروہ ہے۔ دوسرا بے کار امرا اور آوارہ مزاج عوام کا ہے جو ملک کی ترقی میں دیوارِ آہن بن کر کھڑے ہیں۔ ان کی درستی قوم و ملک کی درستی ہے۔

مسٹر گھوش! تم خود تہذیب و ترقی، ایثار و قربانی کی طرف مائل ہو جاؤ

تو کروڑوں نہیں اربوں بندگانِ خدا کی بہتری کے ضامن ہو سکتے ہو۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ تم نے کچھ تھوڑا علم پڑھا لیکن اپنے بچّوں کی تعلیم سے غافل رہے۔ اس لئے تمہارے خون کی کائنات میں ترقی اور تعلیم کا کوئی ولولہ نہیں۔ یہ جوگی جو اللہ سے لَو لگائے ہوئے ہیں۔ اس دنیا کی کشمکش سے بیگانہ ہیں۔ انکے خون کی کائنات میں جوشِ عمل نہیں۔ ان اللہ والوں میں اتنا نظم نہیں اور نہ وہ اسباب انہوں نے مہیا کیٔے ہیں کہ وہ جرثیوں کے حملہ کا دفاع کر سکیں۔ برخلاف اس کے مَیں رات دن تکلیف اٹھاتا ہُوں اور اسی فکر میں مبتلا ہوں کہ کسی طرح ملک اور قوم بامِ ترقی پر پہنچیں۔ میرے اندر کی مخلوقات ترقی پسند منظم اور بہادر ہے۔ تم نے دیکھ لیا کہ انکے اندر نہ صرف اپنی اصلاح کا خیال ہے بلکہ دوسروں کی اصلاح کا بھی سچّا جذبہ موجزن ہے۔

ڈاکٹر بوس کی اس مختصر تقریر نے جوگی اور گھوش دونوں کی گردنوں کو ندامت سے جھکا دیا۔ ان میں اپنی بے مصرف زندگی کا احساس پیدا ہو گیا۔ جو عمل میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ انکے چہرے انکے تبدیل شدہ خیالات کے آئینہ دار تھے۔ ڈاکٹر بوس ان کے خیالات کی اس تبدیلی سے بڑا ہی خوش تھا۔ اس خیال کے پیشِ نظر کہ مبادا جوگی اور گھوش اسکے سامنے گذشتہ بے مصرف زندگی کا اعتراف کرکے آئندہ صلاح کے اقرار کی زحمت اور ندامت

اٹھائیں، مسٹر گھوش کو یوں مخاطب کیا۔

مسٹر گھوش تم قطرہ ہائے خون کی مخلوق کی آواز سننا چاہتے تھے لیکن میں نے اعترافِ عجز کر کے تمہیں بتایا تھا کہ میں اتنی باریک آواز کو آلات میں جذب کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ وہاں عالمِ نباتات کی سرگوشیاں تمہارے گوش گذار کرنے کے قابل ہوں۔ اگر تم ان کی گفتگو سننا پسند کرو تو میں ابھی یہ خدمت انجام دینے کو تیار ہوں۔

عالمِ نباتات

گھوش اور جوگی اس نئے تماشا کو دیکھنے کی دعوت کو کیسے مسترد کر سکتے تھے فوراً آمادہ ہو گئے۔ ڈاکٹر نے دونوں کے لئے صحنِ باغ میں کرسیاں بچھا دیں۔ اور خود جہیر الصوت کے نئے آلات سائنس روم سے نکال کر باغ میں لگانے میں مصروف ہو گیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر آلات کو نصب کر کے ربڑ کی دو نالیوں کو کان میں لگا کر پہلے خود آواز سننے لگا۔ پھر مسکرا کر ان دو نالیوں کو گھوش کے حوالے کیا۔ اور کہا کہ ان دو نالیوں کو کان میں لگاؤ اور ذرا بتاؤ کہ نونہالانِ چمن کیا کہہ رہے ہیں۔

ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے گلاب جھوم گیا اور کھلکھلا کر کہنے لگا بی چمبیلی ہندوستان کے حسن پرست لوگ مادر زاد شاعر ہیں ہم انکے کتنے مشکور

مشکور ہیں کہ ان کی عمر ہماری مداحی میں گزرتی ہے۔ نہ انہیں ہمسائے کی خبر نہ دنیا کی ترقیوں سے واقفیت، نہ قوم کی فلاح سے سروکار نہ ملک کی آزادی کی طرف توجہ۔ وہ حسن کے باغ میں سرو قد محبوب اور گلبدن حسین کی رعنائیوں میں گم رہتے ہیں۔ ان کا ممدوح گلِ خوبی اور سروِ باغ محبوبی ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ چمن کا پتا پتا ڈالی ڈالی ان کے ممدوح کی مداحی کے کام آتا ہے۔ آنکھیں نرگس۔ زلف سنبل، دانت چمبیلی، سینہ گلاب، زنخدان سیب، چھاتیاں انار گویا محبوب سب ڈال پات کا بوجھ اور پھل پھول کا ٹوکرا اٹھائے مٹک مٹک کر جا رہا ہے (مسٹر گھوش نے پھول کی زبان سے ہندوستان کے معشوق کی یہ تعریف سنی تو لوٹ گیا)

چمبیلی چٹک کر بولی بھلے صاحب عمرِ عزیز کو الفاظ کے الٹ پھیر میں کھو دینا بھی کوئی شاعری ہے۔ ہندوستان کی اتنی بڑی آبادی کے بہترین دل و دماغ نے لفظوں کی صناعی میں عمر کھو دی۔ گر حسنِ ترتیب ہی سچی شاعری ہے تو یہ محض لفظوں کی حسنِ ترتیب کیوں ہو۔ تاج محل کا انجینیر شاعر تھا جس نے عشق کو پتھر میں ڈھال لیا۔ جو آواز کو ترتیب دے کر دلوں میں آگ لگاتا ہے وہ بھی شاعر ہے۔ محبوب جو تزئینِ حسن سے اطمینانِ دل لوٹ لیتا ہے شاعر ہے۔ نوجوان کو ترتیب دینا بھی شاعری ہے۔ ایسی مفید شاعری سے قوم کی زندگی کو بہتر کیوں نہ بنایا جائے۔ پرزوں کی ترتیب میں شاعری کر کے مفید کلیں ایجاد کیوں نہ

کی جائیں۔ بلنکے سپاہی کی طرح جسم پر ترتیب سے ہتھیار سج کر نظم کیوں نہ کہی جائے۔ پہاڑ کے جگر سے نہر کاٹ کر شعر کیوں نہ کہا جائے۔ بڑے آہنی پل بنا کر شعر کی داد کیوں نہ لی جائے۔ بساطِ سیاست پر بہترین چالوں سے شاعری کیوں نہ کی جائے۔ حسنِ ترتیب پر جان دینے والوں کا نام ہی عاشق ہے۔ جس ملک میں صحیح معنوں میں عمدہ شاعر اور سچّے عاشق پیدا ہوں اس کا کیا کہنا۔ ہر صناع ہر انجنیر ہر کمانڈر ہر سیاست دان شاعر ہے۔ بشرطیکہ حسنِ ترتیب کے لئے وہ قابلِ داد قرار پا جائے۔

بد قسمت ہندوستان میں بیکار شاعر بھرے پڑے ہیں اور ترقی یافتہ ملکوں میں ہر رنگ کے شاعر موجود ہیں۔ قومیں وہی ترقی کر سکتی ہیں جن میں کثرت سے ہر قسم کے اعلیٰ شاعر موجود ہوں۔ جو قوم مجموعی طور سے شاعری میں بڑھ جاتی ہے وہی دنیا پر اپنی فوقیت کا ڈنکہ بجاتی ہے۔

ہندوستان کے عاشق بھی عجب ہیں۔ پسِ پردہ بیٹھنے والیوں کو گھات لگا کر دیکھتے ہیں۔ حسنِ راہگذر کو آنکھوں سے کھا جانا چاہتے ہیں محبوب ننھا خرام کو چوم کر چمپت ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں آبدار تلوار کے برق پاش حسن کو دیکھ کر اسے گلے لگانے والا کوئی بھی طالب نہیں۔ پھانسی کے بلند قد پر قربان ہونے والا محبِ وطن نہیں۔ قلعہ شکن توپوں کی اڑاڑادھم کی آواز پر مبہوت ہو جانے والا عاشق نہیں۔ اس ملک میں لوگ

کسی موجد، صناع، انجنیر اور کمانڈر اور ریاست داں کا کبھی محفل میں ذکر نہیں کرتے۔ ایسے لوگ بزم مشاعرہ میں داد سخن تو دے سکتے ہیں لیکن دادِ عمل نہیں دے سکتے۔

مسٹر گھوش چمبیلی کی زبان سے یہ سن کر سکتہ میں آگیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد گلاب اور چمبیلی کی گفتگو جوگی اور بوس دونوں کے سامنے دہرائی۔

جوگی نے کہا صانعِ قدرت نے اس کائنات کو پیدا کر کے ایک ایسا دل پسند شعر کہا ہے جس کی حسنِ ترتیب عقل سے داد چاہتی ہے۔ جوگی ہر چند قابلِ ملامت فرقہ سہی لیکن صانع کے سچّے عاشق ہیں۔ وہ اسی کے عشق میں مگن رہتے ہیں۔

مسٹر بوس نے کہا کہ تصوّرِ جاناں میں رہنا قابلِ قدر بات نہیں۔ بلکہ اسکے اشارۂ ابرو پر قربان ہونا بہترین عبادت ہے۔ کائنات کی ہر چیز بامعنی گردش میں ہے۔ کھلا اشارہ ہے کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا قدرت کو ناپسند ہے۔ پسندیدہ روش یہ ہے کہ اس کی مخلوق کی بہترین خدمت کا جذبہ لے کر اُٹھیں تاکہ ہماری حرکت میں برکت ہو۔

جوگی جانتا تھا کہ پودوں کی گفتگو خلافِ واقعہ نہ ہوگی کیونکہ وہ اس سے پہلے عقل کو حیرت میں ڈالنے والا تجربہ دیکھ چکا تھا۔ تاہم اُس نے ربڑ کی نالیوں کو اٹھا کر کان میں لگا لیا۔ اُس نے سرو کو کہتے سنا۔

"بی جمیلی محبت اور رحم مذہب کی اساس و بنیاد ہیں لیکن اہلِ مذہب صاحبانِ ثروت کے ہتھے چڑھ کر بے مہر اور بے رحم ہو گئے۔ اربابِ سیاست کے ہاتھ میں موم کی ناک ہو کر انسانیت کے مقدر میں پتھر پڑ گئے۔ دنیا میں اربابِ بست و کشاد نے جب غریبوں سے منہ موڑ لیا اور اہلِ مذہب نے اس بے رخی میں اقتدار اور ثروت کا ساتھ دیا۔ تو محنتی مزدور نے اپنی حالت بدلنے کے لئے کروٹ لی۔ دنیا میں اقتصادی ہلچل شروع ہو گئی۔ سرمایہ محنت سے ٹکرا گیا۔ اہلِ مذہب بھی سرمایہ داروں کے پلڑے میں تُل کر مغضوب ہو گئے۔ عام آبادی کے مقابلہ میں امرا آٹے میں نمک تھے۔ چٹ ہو گئے۔ مذہب عام آبادی کا قانونِ اخلاق ہے اور محنت عام آبادی کا قانونِ اقتصاد۔ ان دو میں وجہ جنگ موجود نہیں مگر جنگ جاری ہے۔ مذہب کیفیت ہے۔ اقتصاد کمیت ہے۔ کیف و کم میں نزاع کیوں ہے۔ اگر انسانی زندگی میں سرمایہ داری کو نظر انداز کر دیا جائے تو مذہب اور اقتصاد میں جنگ نہ رہنا چاہیئے۔ پس مذہب افیون نہیں جو محنت سے باز رکھے۔ بلکہ وہ قوتِ فکر ہے جو ایک طرف قوائے عمل کو متحرک کرے اور دوسری طرف بے اطمینانی کو دُور کرے۔ دل پر خوشی کے دروازے کھول دے محض اقتصاد وہ ساز ہے جس میں آواز نہیں۔ سازِ بغیر آواز کے کسی کیفیت کا حامل نہیں۔ اقتصادی ساز میں سوز پیدا کرنے کیلئے کیف آور مذہب کی ہم آہنگی ضروری ہے تاکہ انسانی زندگی کیف و سرور کی جلوہ گاہ ہو۔

مغرب اقتصادی مسائل میں منہمک ہے۔ مشرق مذہب کی کیفیتوں میں کھویا ہُوا ہے۔ انسانیت دونوں سے بیزار ہے۔ وہ دونوں کا اتحادِ عمل چاہتی ہے اقتصاد جسم ہے مذہب روح ہے جسم اور روح کے اتحاد سے زندگی بنتی ہے جوگی روح کی رفعت چاہتا ہے بھوگی محنت میں بسر اوقات کرتا ہے جب جوگی اور بھوگی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سفرِ زندگی اختیار کریں تب دنیا کا جہنّم جنت میں بدل سکتا ہے محض اقتصادیات خشک بنجر ہے محض عبادت افیون کی طرح قوائے عمل کو بے حس کر کے قوموں کو سلا دیتی ہے محض عبادت فرشتوں کا فعل ہے محض محنت گدھے کا کام ہے۔ انسان عمل اور عبادت کا مجموعہ ہے۔ اقتصاد اور مذہب دونوں کا منصفانہ اتحادِ عمل زندگی کی کشتی کو ساحلِ مراد پر پہنچانے کا بہترین ضامن ہے۔

ایک انسان کو محنت کے مواقع اور پیٹ پالنے کے سامان ہی مہیا نہ ہونے چاہئیں۔ بلکہ اپنے ہم جنسوں سے مہر و محبت کے سلوک کا درس بھی دینا چاہئے جس کے بغیر مزدور کی ظاہری خوشی میں قلب کا اطمینان ممکن نہ ہوگا۔ ہم جنسوں سے گہری محبت کا نام ہی مذہب ہے محبت سے ہی طبیعت میں جنت کا اطمینان اور رنگینی پیدا ہوتی ہے۔ اقتصاد کی وہ عمارت جو رحم اور محبت کی بنیاد پر استوار نہ کی جائے گی وہ ریت کی دیوار ثابت ہوگی۔

چمبیلی نے لچک کر کہا میں تمہارا منشا سمجھ گئی۔ روس سے جو اقتصادی

طوفان امنڈ رہا ہے تم اُونچے ہو کر اس کی بے پناہیوں کو دیکھ رہے ہو۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ صرف جھوٹے مذہب کو بہا لے جائے گا۔ جس مذہب کی بنیاد مہر و محبت رحم و خدمت اور انسانیت کی سربلندی پر ہوگی وہ طوفان میں مضبوط چٹان کی طرح قائم رہے گا۔ طوفانی لہریں شور کرتی ہوئی اُس سے سر ٹکیں گی۔ اور پاؤں دھو کر چلی جائیں گی لیکن غریب اور مزدور کی سربلندی لازمی ہے۔ جھوٹے مذہب اور نسلی امتیازات کی شر انگیز سرحدات کا مٹ جانا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مذہب کے خیالی خطرے کے پیش نظر ہم ان قوتوں اور ایسے امتیازات کو باقی رہنے میں مدد دیں۔ جن کے باعث تمام عیش و آرام اقتدار اور قوت صرف چند آدمیوں کے لئے مخصوص ہو گئے ہیں۔

سرو نے کہا میں مانتا ہوں کہ میرے ذہن میں مذہب کے خلاف روس کے اقدامات تھے۔

چمبیلی نے کہا تم نے مذہب کی تعریف کر دی کہ رحم اور محبت اسکی اساس و بنیاد ہیں۔ روس میں یہ دونوں چیزیں باقی نہ رہی تھیں۔ وہاں وہم اور ریاکاری رہ گئی تھی ظلم عام رواج پا گیا تھا۔ مذہب کے پیشوا خدا سے ڈرنے کی بجائے حکومت سے ڈر کر ہر تحریک کے مخالف تھے جو انسان کو سربلند کر دے۔ تھوڑے سے دنیاوی فائدے کے لئے وہ مذہب فروشی کرتے تھے۔

سرو۔ لیکن اب تو خدا کے نام سے بیزار ہیں۔

چمبیلی۔ ہاں۔کس خدا کے نام سے؟ اُس خدا کے نام سے ظالم جس کا نام لے کر ظلم شروع کرتا ہے۔ پیشوا جس خدا کی تسبیح کے بعد فریب کرتا ہے۔ اقتدار پسندوں کا مذہبی ایجنٹ قیامِ امن کے لئے جمہوریت کے خلاف جس خدا کا نام استعمال کر کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔ جس خدا کا مظہر بن کر انسان کو انسان اپنے قدموں پر گرانے کی کوشش کرتا ہے۔

کوئی شخص اس خدا کا مخالف نہیں ہو سکتا جو کائنات کا پروردگار ہے یعقل جس کی عظمت میں سرنگوں ہے اس خدا کا کوئی دشمن نہیں جسکا نام لے کر انسان نیکی کی اشاعت کے لئے نکلتا ہے اور تلوار ٹیک کر ظلم کے مقابلہ کے لئے اٹھتا ہے۔ ہتھیار سج کر آزادی کی جنگ میں جاتا ہے بعض دفعہ بے شک عارضی اور جوش کے ماتحت آدمی ہرزہ سرائی کرتا ہے لیکن اس وقت عقل دماغ سے نکل چکی ہوتی ہے۔ عقل اس کے دماغ کے خانہ میں لوٹ آنے کے بعد انسان خدا کی عظمت کا پھر قائل ہو جاتا ہے۔

گلاب نے کہا عجب بات ہے کہ انسان ہمارا ذکر خوشی سے کرتا ہے اور ہم سب ہر وقت ان مباحث میں پڑے رہتے ہیں جن کا تعلق انسان سے ہے۔

جامن بولی۔ چھوڑو اِن دو پاؤں کے قصوں کو۔ کچھ اپنی سی کہو۔ دیکھو اب کے کیسی ہوا چلی ہے۔ ہر پودے کو زکام ہے۔ کئی تو کھانستے کھانستے صبح کرتے ہیں

آم نے کہا سچ ہے بی جامن میری اپنی طبیعت بھی ان دنوں خراب ہے۔ پچھلے سال بھی یہی حال رہا تھا اور پھل کم آیا تھا۔ اس دفعہ تو جان ڈرتی ہے یہ حضرت انسان دو سال پھل نہ آئے تو بے مروتی میں کمال کو کھاتا ہے۔ جڑ سے کاٹ کر ایندھن بناتا ہے۔

جامن نے کہا خدا ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ انسان تو ذاتی فائدے کے لئے بھائی کا گلا کاٹتا ہے ہم اسکی نظر میں کیا ہیں۔

جوگی نباتات کی اس کلام سے از بس حیران ہوا۔ ساری گفتگو دہرائی گھوش اور جوگی نے اقرار کیا کہ زندگی نئے سانچے میں ڈھالیں گے۔ خدا کی بے پایاں مخلوق میں جاری و ساری قانون پر عمل کرینگے۔ اجتماعی فلاح و بہبود کے مقصد کو اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کریں گے۔ زندگی مخلوق کی خدمت میں بسر کرینگے

پرندوں کی گفتگو۔ اتنے میں ایک خاکی پر ہلکا پھلکا پرندہ جامن کی شاخ پر آبیٹھا۔

جوگی نے تعجب سے سنا کہ پرندہ نے بیٹھتے ہی چمن کے جملہ نونہالوں میں سے ایک ایک کی خیر خیریت پوچھنا شروع کی۔

جامن نے کہا کہ اے گل نور اپنی کہو کہ تین سال سے کہاں غیب رہے ہے۔

کیا کہوں بی جامن، گل نور نے کہا۔ سردار شتاب گل کا مدت سے اصرار تھا کہ قطب ستارے کی سیر سے سب لطف اندوز ہوں ہمیں سخت

قابل تھا۔ اب کے جو افریقہ گئے سخت مصیبت کا سامنا ہُوا۔ ژالہ باری نے فصلیں تباہ کر دی تھیں۔ ملک میں چڑی ماروں کی تعداد میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ پیٹ کے بھوکے سب ہی ہماری طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ جس کو دیکھو ہماری جان کا لاگو تھا۔ جب سب کی جان کے لالے پڑے تو سردار شناب گل نے نقل مکانی کا حکم دیا۔ تم جانتی ہو بی جامن کہ سردار شناب گل سب سے زیادہ ذکی الحس ہے وہ قطب ستارے کی طرف دیکھ کر ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اس ستارے میں ہمارے لئے عمدہ ترین غذا ہے۔ اور وہ کچھ دور مقام نہیں۔ ہم سب کی صلاح یہی ٹھہری کہ چلو وہاں چل کر دانہ دنکا چگیں۔ غیر دنیا کی سیر کریں۔ سات سال ہوئے کہ ہم زہرہ ستارے میں ہو آئے تھے مگر وہ اس دُنیا سے زیادہ زرخیز نہ تھا۔ اس لئے چھ ماہ رہ کر لوٹ آئے۔ اس دفعہ ہم اپنے سردار کی رہنمائی میں قطب ستارے میں گئے تھے۔ وہاں عجب بہار اور عجب سیر تھی۔ تین سال تک لوٹنے کو دل نہ چاہا۔

آم نے کہا اے گل نور تم خدا کی عجب خلقت ہو۔ یہ تو بتاؤ تم جو پہاڑوں اور سمندروں کا کئی کئی روز سفر کرتے ہو کیونکر جانتے ہو کہ کہاں جا رہے ہو۔ کیا تمہیں راستہ کھو جانے کا ڈر نہیں ہوتا۔

راستہ کھو جانے کا ڈر؟ گل نور نے ہنس کر کہا۔ خالق نے ہمارے دماغ میں قطب نما کی طرح باریک سوئیاں رکھی ہیں۔ جو سمت کا تعین کرتی ہیں۔

اِن ہی کی رہنمائی میں ہم ہزاروں میل کا سفر کرتے ہیں کیا مجال کہ کوئی غلطی ہو جائے۔ علاوہ ازیں ہمارے ارادے اور اِن سوئیوں میں کوئی خاص تعلق ہے۔ یہ ہمارے ارادے کے مطابق سمت کا تعین کرتی ہیں جس ملک جس براعظم کا قصد کریں۔ قصد کے ساتھ ہمیں اِن سوئیوں کے ذریعے سمت کا بھی القا ہو جاتا ہے۔

قدرت کے کیا کیا کھیل ہیں۔ جامن نے کہا۔

آم بولا کہ اس دنیا کی خشکی اور تری کے سفر کا حال تو سمجھ میں آ گیا مگر غیر دنیا میں جانے کا حال تو کہو کیونکر پہنچے۔

گل نور نے نازک پر پھڑپھڑا کر کہا۔ جانِ برادر بظاہر بلندی کا سفر پستی کے سفر سے زیادہ آسان تھا۔ ابتداء میں میں نے سمجھا کہ منزل مقصود پر پہنچنے کیلئے شاید پانچ مہینے لگ جائیں۔ اس لئے چربی حاصل کرنے کے لئے بڑا تردد رہا۔ تم چربی کا مفہوم شاید نہ سمجھ سکو۔ یہ تحلیل شدہ غذاؤں کا جوہم کھاتے ہیں ست ہوتا ہے جس طرح اونٹ اپنی خوراک کوہان میں رکھ لیتا ہے اسی طرح یہ چربی ہم پوٹے کے قریب ایک گوشے میں رکھ لیتے ہیں اس سے مہینوں دانہ پانی کے بغیر ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ غرض چربی پوٹے کے ایک گوشے میں جمع کر کے سردار شناب گل کی رہنمائی میں اُوپر اُڑے۔ تین دن تک کششِ ثقل کے باعث ہمیں معمولی زور لگانا پڑا مگر تین روز کے بعد ہمیں معلوم ہُوا

کہ ہم خود بخود کھنچے چلے جا رہے ہیں معلوم ہؤا کہ زمین کی کشش ختم ہو گئی ہے اور اب ہم ستارے کی کشش کے زیرِ اثر ہیں۔ ہم نے پھیلائے ہوئے پر سمیٹ لئے اور چھوٹے گیند کی طرح اس ستارے کی طرف گرے ایک رات دن ہم یوں ہی گرتے گئے تا آنکہ سردار نے بآوازِ بلند کہا قطب کی زمین قریب آگئی۔ ہم نے بھی دیکھا کہ افق پر سیاہی سی نمودار ہوئی۔ ہم نے سن کر خدا کی حمد میں وہ گیت گایا جو نمودِ صبح پر ہم ہر روز گایا کرتے ہیں۔ ہم نے بلندی سے دیکھا کہ قطب کی زمین گل بوٹوں سے بھری پڑی ہے۔ اس دنیا میں تو ایک وادیٔ کشمیر ہے وہاں جدھر نظر اُٹھتی تھی باغ و انہار تھے۔ ہم رغبت کر کے اُترے۔ سبز درختوں کی شاخوں پر بیٹھ گئے۔ وہاں کے جانور بھی کتنے خوش خلق تھے۔ ہمارے وہاں پہنچنے پر انہوں نے خوش آمدید کہا۔ ہمارا حال پوچھا، اپنا بتایا اپنے ملک کا چپّہ چپّہ دکھایا۔

جامن نے کہا گل نور تم تو سوکھ کر کانٹا ہو رہے ہو۔

گل نور پرندے نے کہا میں ہی کیا سب کا یہی حال ہے۔ ہر چند وہاں کے نظارے رشکِ جنّت نگاہ تھے۔ مگر آب و ہوا سوہانِ روح تھے۔ اندر ہی اندر بغیر غم کے ہم گھُل رہے تھے۔ اس فردوس بریں کو چھوڑ کر آنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ مگر وہاں رہنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ لاچار ہمیں واپس اس جگہ آنا پڑا۔ اگرچہ یہ دنیا اسکے مقابلہ میں اجڑی بستی ہے مگر آخر وطن عزیز ہے۔ اس کے

تصور سے دل میں اک ہوک سی اُٹھتی تھی جی چاہتا تھا کہ پیارے وطن کو چلکر دیکھیں کہ اس کا کیا حال ہے۔ چند روز ہوئے کہ قطب ستارے سے چل کر ہم امریکہ کی سرزمین میں اترے۔ وہاں سے اڑ کر یہاں آئے۔

آم نے کہا کیا قطب ستارے میں بھی انسان جیسے بر خود غلط اور خود غرض دو پائے رہتے ہیں۔ ان کی کیا کیفیت ہے۔

گل نور پرندے نے بتایا۔ ان کے متعلق ایسا نہ کہو وہ اس دنیا کے انسانوں سے ہر حال میں بہتر ہیں بلا علمی کے باعث انسان بر خود غلط ہوتا ہے، وہ لوگ اربابِ علم ہیں۔ خود غرضی کا وہاں موقعہ ہی موجود نہیں۔ ہر ایک کو رزق اور سامانِ تفریح کی بہتات ہے۔ ملک خدا کا سمجھا جاتا ہے۔ ہر قسم کی دولت اور پیداوار سے یکساں طور پر فائدہ حاصل کیا جاتا ہے۔ وہاں سودی کاروبار قابلِ تعزیر ہے۔ سود حاصل کرنا وہاں اپنے بھائی کی تکلیف سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اگر کسی کے پاس پچاس روپے ہوں وہ سرمایہ دار سمجھا جاتا ہے۔ حکومت اس سے سرمایہ داری کا ٹیکس وصول کرتی ہے۔ بہتر شہری وہاں وہ سمجھا جاتا ہے جو غریب اور مسکین ہو یعنی سرے سے کوئی سرمایہ ہی نہ رکھے۔ اور پوری محنت کے بعد بیت المال سے جو حصہ اسے ملے اسی پر اکتفا کرے۔ خاص خاص حالتوں میں روپیہ کمانے کی اجازت ہے مگر موت کے بعد جائداد رشتے داروں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ غرض ایسا انتظام

ہوتا ہے کہ کوئی شخص تا دیر ذاتی سرمایہ رکھنے ہی نہیں پاتا۔

اگر حاکمِ وقت کو یہ معلوم ہو کہ کسی نے جائز طور پر اتنا سرمایہ فراہم کر لیا ہے کہ وہ سوسائٹی میں سرمایہ کے بل پر ہر دلعزیز قابلِ عزت یا نمایاں ہو رہا ہے تو حاکم ضبطی جائداد کا حکم دے سکتا ہے۔ یا اگر حاکمِ وقت کے علم میں یہ بات لائی جائے کہ فلاں امیر شخص سرمایہ کو دفن کر رہا ہے۔ یا سرمایہ بیکار پڑا ہے تو ایسا سرمایہ بھی قابلِ ضبطی ہوتا ہے۔

ضبطی ایک ہی حربہ نہیں بلکہ آئے دن خدا کے نام پر سرمایہ داروں کو ابھار کر ان سے روپیہ وصول کر کے رفاہ عام کے کاموں پر لگایا جاتا ہے کوئی شخص کسی کو ملازم نہیں رکھ سکتا جب تک اس سے برابر کے بھائی کی طرح سلوک نہ کرے۔ وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے۔ وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے۔ مالِ تجارت میں حصہ دینا پڑتا ہے۔ ہر حال میں خاندان کا فرد سمجھنا پڑتا ہے۔

غرض وہاں کی حکومت کو اس امر کا پورا اختیار ہے کہ کسی کو کسی حد تک سرمایہ رکھنے کی اجازت دے یا سرے سے چھین لے۔ جس کو سرمایہ رکھنے کی اجازت دے اس پر کڑی نگرانی رکھنا پڑتی ہے۔ ۵۰ روپے کی رقم کے بعد سرکاری ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ عذر قابلِ سماعت نہیں کہ امسال سے خسارہ رہا۔ جب تک وہ ۵۰ روپے سے زیادہ جائداد رکھتا ہے تب تک

وہ سرمایہ دار ہے۔ اور قابلِ ٹیکس ہے۔

جامن۔ اقتصادیات کا تو یہ اسلامی تصور ہے۔

آم۔ مگر جائز طور پر فراہم شدہ سرمایہ اسلام کے رو سے بحق سرکار ضبط نہیں ہو سکتا۔

گل اُور۔ تعجب ہے آم، تم نے اسلام کے اقتصادی اصول کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ اسلام ملک کو خدا کی ملک قرار دیتا ہے۔ خدا کی ساری مخلوق زمین پر یکساں حق رکھتی ہے۔ اب جمہور بعض پابندیوں کے ساتھ تجارت اور زراعت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں مجلسِ شوریٰ جو اقتصادی قانون چاہے بنائے بشرطیکہ خدا کی بنا کردہ حدود سے تجاوز نہ ہو۔

آم۔ یعنی۔

گل اُور۔ یعنی مجلسِ شوریٰ یا اس کا نمائندہ خلیفہ اڑھائی فی صدی سے زیادہ تو غریب ٹیکس یعنی زکوٰۃ وصول کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے کم وصول نہیں کر سکتا۔

آم۔ اُلٹی بات یہ کیونکر نہ زیادہ وصول کر سکتا ہے نہ کم وصول کر سکتا ہے

گل اُور۔ نہیں سیدھی بات یہی ہے کہ خلیفہ یا مجلسِ شوریٰ اڑھائی فیصدی سے کم وصول نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر ضرورتِ وقت داعی ہو تو سلطنت

کی ضرورت کیلئے سب سرمایہ بحق سرکار ضبط ہو سکتا ہے۔

آم۔ مَیں اس پر سوچوں گا یہ چیستان میری سمجھ میں نہیں آتی۔

گُل نور۔ بہرحال ان اقتصادی قوانین کی بنا پر وہاں خودغرضی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہر بچے کے لئے سرکاری خرچِ خوراک اور خرچِ تعلیم مقرر ہے۔ ساٹھ برس کے بعد محنتِ شاقہ سے سبکدوشی حاصل ہو جاتی ہے۔ بیماری کی حالت میں سرکاری طبیب مقرر ہیں۔ جو علاج مفت کرتے ہیں۔ مردانہ اور زنانہ تفریح گاہیں بنی ہیں۔ وہاں تو سرمایہ رکھنا بے وقوفی ہے۔ چھ گھنٹے کی محنت کے بعد آرام ہی آرام ہے۔ خلافِ طبیعت محنت نہیں کرائی جاتی۔ اس لئے بعض لوگ بہت زیادہ محنت کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو طبّی سرٹیفکیٹ حاصل کرنا پڑتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر زیادہ محنت کے قابل بھی ہیں یا نہیں۔ صحت وہاں سب سے مقدّم چیز ہے۔ بیمار اور کمزور آدمی کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ممبر محلّہ کا کام ہے کہ ہر کمزور شخص کی رپورٹ کرے۔ کمزور کا ڈاکٹری معائنہ کرائے اور ضلع کے حاکم کو علیحدہ اطلاع دے۔

گھروں کی صفائی کا کیا کہوں۔ لوگ ایسے خوش ذوق ہیں کہ غلاظت کے تصور سے کانپ اُٹھتے ہیں۔ کوئی گھر تو ایسا نہیں جہاں باغیچہ نہ ہو

اور کیا مجال کہ کہیں خزاں دیدہ پتہ گرا پڑا نظر آئے۔ محلے اور بازار میں اگر کوئی پتہ یا کاغذ کا پرزہ بھی پڑا نظر آجائے تو جو اسے دیکھے گا وہی اٹھانے کو دوڑے گا۔ وہاں یہ انتظار نہیں کیا جاتا کہ کوئی خاکروب آئے اور اسے اٹھائے۔

اگر تم اس ملک کو ایک نظر دیکھو تو باغ جناں کا خیال نہ کرو۔ وہاں کی حکومت اور لوگوں کی ہمت نے ملک کو جنت گاہ بنا دیا ہے۔ شاداب پہاڑوں کو بہترین باغیچہ بنا دیا گیا ہے۔ پتھر کا جگر کاٹ کر پانی کی ندیاں بہادی گئی ہیں۔ میدان کو مرغزار اور گلزار بنا دیا گیا ہے۔ اس ملک کے حسن اور رنگینی کو دیکھ کر خود طبیعت باغ و بہار ہو جاتی ہے۔ وہاں عورت اور مرد حور و غلمان ہیں صحت اور صفائی نے ان کے حسن میں رعنائی بھر دی ہے اے کاش اس ملک کے لوگ بھی اپنے خیال میں اصلاح کریں خود غرضی کو چھوڑ کر اہل ملک کی خدمت میں عظمت سمجھیں۔ ہمیں تو کیا کچھ اپنی نسل کی بھلائی کا ہی سامان کریں۔

اندرا اس کہانی کو سُن کر گہری سوچ میں پڑ گئی۔ اگلے روز اندرا نے افاقہ سا محسوس کیا۔ فرحت کے آنے سے پہلے آئینہ رُو ہو بیٹھی۔ اپنے رنگ روپ کو دیکھا، باوجود آئینے کی تسلی کے اسکی آنکھیں نمناک

تھیں۔ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ اس کا حسن فرحت کے دل میں محبت کی آگ روشن نہیں کر سکا۔ وہ فرحت کی آہٹ پاکر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ وہ آیا تو اندرما نے محبت سے اسکی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں بجز ہمدردی کے کوئی اور جذبہ نہ پایا۔ فرحت نے بھی اسکے فروغ حسن کو دیکھا اور حسب معمول دوشیزہ کی طرح آنکھیں جھکالیں۔ اور نئی کہانی کو یوں شروع کیا۔

اہنسا

ہندوستان میں انار بہ راجاؤں کا زمانہ تھا۔ اشٹی ریاست علم و تہذیب کا گہوارہ تھی۔ اہنسا ان کا مذہبی فلسفہ تھا۔ جان کا اتلاف مہا پاپ تھا۔ پھر بھی ضرورت کبھی کبھی انہیں مذہب کے خلاف اقدامات پر آمادہ کر دیتی تھی۔ بعض جانور جو کھیتی کی بربادی کا باعث تھے مارے ہی جاتے تھے۔ موذی ایذا کے قبل ہلاک کر دیئے جاتے۔ لیکن تاہم جیسی میری جان ویسی سب کی جان کا خیال ایسا ناقابلِ تردید تھا کہ طبیعتیں آہستہ آہستہ جنگلی جانوروں اور ایذا دینے والے موذیوں کی ہلاکت کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ مذہب کے عالموں نے سرکار پر زور دیا کہ ہر قسم کے جاندار کو انسانی دستبرد سے بچایا جائے۔ بعض دنیاداروں نے ان دینداروں

کو کہا کہ اگر جانداروں کو ایسی چھٹی دی گئی تو اندیشہ ہے کہ نسلِ انسانی ختم ہو جائے ۔ اور درندے اور موذی جانور ہر طرف نظر آئیں گے۔ مگر ان کی شنوائی ہونے کی بجائے ان پر آوازے کسے گئے ۔ اکثر کے گلے میں جوتیوں کے ہار ڈالے گئے اور منہ کالا کر کے گدھے پر چڑھا کر شہر میں تشہیر کی گئی جس سے سب کی زبانیں بند ہو گئیں ۔ چنانچہ ودوانوں کی رہنمائی میں راجہ نے امتناعِ کلی کا قانون منظور کر لیا ۔ اب جان کا بدلہ جان ملک کا قانون تھا ۔ سانپوں اور بھڑوں کے مارنے کے باعث بہت سے انسان مارے گئے ۔ اس طرح ہمیشہ کے لئے جاں ستانی کا انسداد ہو گیا ۔ کچھ عرصہ مارنے کی بجائے مارا جانا پسند کیا جاتا رہا ۔ جنگلی جانوروں کی اچھی خاصی افراط ہو گئی ۔ رحم دل لوگوں نے اس پر اور کمال کیا کہ رام کے نام پر گائیں چھوڑنا شروع کر دیں ۔ جن کے گلے کھیتوں میں پھرنے لگے ۔

اب حالات نے صورت یہ اختیار کی کہ جانوروں کی افزائشِ نسل میں کوئی چیز مانع نہ تھی ۔ اور موذی جانوروں اور درندوں کی بہتات سے ناک میں دم آنے لگا ۔ طرح طرح کے سانپ ڈالی ڈالی سے لٹکنے لگے ۔ رات کو چلنے پھرنے میں خوف تھا ، مبادا پاؤں زمین پر لگتے ہی ڈس جائیں بعض اوقات کچے مکانوں کی چھتوں سے سانپ اچانک گر پڑتے تھے

ان کے پکڑنے والوں کی روزی میں البتہ اضافہ ہوگیا تھا۔ ان کی ہر جگہ مانگ تھی۔ وہ منہ مانگی اجرت لیتے اور گھر سے سانپوں کو پکڑ کر باہر چھوڑ آتے تھے۔ لیکن اس سے سانپوں میں کمی کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ایک سانپ پکڑا جاتا، دوسرے روز دو نظر آتے۔ قانون کے ڈر سے کسی کو سانپ پر ہاتھ اٹھانے کا حوصلہ نہ تھا۔ بھڑوں کے چھتے چھتوں کو لگے تھے۔ کیا مجال جو کوئی ان کو آگ دکھا سکے۔ تمام ڈسنے والے جانور بے خوف تھے اور صرف انسان بے بس اور خائف تھا۔

بھیڑیے بھیڑ بکریوں کو آبادی میں آکر اٹھالے جاتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مل کر انسانوں پر بھی حملہ آور ہوتے۔ جن شیروں کے منہ کو انسانی خون کی چاٹ لگ گئی تھی۔ انہوں نے ہر قسم کا شکار ترک کر کے انسان کا آسان شکار کرنا شروع کیا۔ تر نوالہ آسانی سے ہاتھ آجائے کون دن میں دس دفعہ نہ کھائے۔ گھروں کی چھتوں پر سونے والے لوگوں کو اٹھا کر لے جاتے تھے۔ شیر کا شکار ہزار واویلا کرتا مگر کوئی مدد کو نہ پہنچتا۔ خطرہ میں جان ڈال کر کون کسے بچائے اور شیر کو مار کر شیر افگن کہلانے کی بجائے نذر دار ہو جائے ماؤں کے جوان بیٹے اژدھے اور شیروں کی نذر ہو گئے۔ ہر طرف قیامت بپا تھی۔ رام گئوؤں نے کھیتی چھوڑ تنکا باقی نہ چھوڑا تھا جو ان کو ڈراتا وہ سینگ اٹھا کر آتیں۔ خیر یہ تو رام گائیں تھیں کھیتوں میں چوہے قلابازیاں کھاتے

تھے۔ دانہ زمین میں پڑنے سے پہلے کھایا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ کھیتوں میں ببول کے کانٹے اگے رہ گئے۔ ریاست میں قحط عام نمودار ہوا لوگ گھروں کو چھوڑ جان بچا کر یہاں سے نکل بھاگے۔ ایک آدھ دس بیس نقل مکانی کر کے جائیں تو کوئی آؤ بھگت کرے۔ جب لاکھوں کی تعداد میں نقل مکانی کا ارادہ رکھتے ہوں تو انہیں کون قبول کرے اور کہاں رکھے؟ کیا انتظام کرے؟ قریب پاس کی ریاستوں نے ان کے داخلہ پر پابندی عائد کر دی۔ اس طرح لوگ مصیبتوں کے دوزخ میں قید ہو گئے۔

یہ ساری مصیبتیں غربا پر تھیں، امرا محفوظ تھے۔ پختہ فرش، پختہ مکان دیکھ بھال کرنے والے پہرہ دار، مضبوط کواڑ، اونچی اونچی عمارت شیر اور اژدھے دونوں مداخلت سے محروم تھے۔ جب غربا کی مصیبتیں حد سے بڑھ گئیں تو انہوں نے راتوں رات مختلف ریاستوں میں کوچ کر جانے کا ارادہ کیا۔ کسی نہ کسی طرح ریاست کے والیوں کو خبر ہو گئی۔ انہوں نے فوجی چوکیاں بٹھا دیں کہ جو سرحد سے پار ہو اسے زندگی کی سرحد کے پار کر دیا جائے۔ ناچار سب قسمت کو رو کر بیٹھ گئے لیکن آفات ارضی سے پناہ کہاں تھی۔ اہنسا پرم دھرم کی فضا میں ایک مدت سانس لینے کے باعث ان میں جنگی جوش نہ رہا تھا۔ ورنہ اگر مرنا ہی تھا تو مار کر مرتے۔ جنہوں نے کبھی

خود ہی جانور کو نہ مارا تھا۔ ان میں انسانی جان کو مارنے کا حوصلہ نہ رہا تھا۔

ایک دن ایک شخص نے ایک کالے ناگ کو جو اسکے تعاقب میں آرہا تھا لاٹھی سے مارا۔ سانپ پیچ وتاب کھانے لگا۔ انسان بھی کیا عجب حیوان ہے۔ سب دکھوں کو بھول اس آدمی کو ملامت کرنے لگے۔ سپاہی نے آکر پکڑ لیا۔ اُس نے لوگوں کو کہا اے لوگو عجب حال ہے کہ ان موذیوں کے ہاتھ سے ہزاروں جوان راہئ ملکِ عدم ہوئے۔ تمہیں اپنے ہم جنسوں سے محبت نہیں، ہاں موذیوں سے محبت ہے۔ سانپ کے پیچ وتاب کو دیکھ کر لوگ خود اسکے خلاف پیچ وتاب کھاتے تھے۔ کسی نے پروا نہ کی۔ ملک کے قانون کے مطابق عدالت نے سلوک کیا اور پھانسی کا پھندا اسکی سزا تجویز ہوئی۔ پھانسی پانے سے پہلے اس نے سپاہیوں کو پھر مخاطب کیا اور کہا:۔

مُوذیوں اور درندوں کے باعث انسان ہلاک ہو رہے ہیں۔ ملک میں قحط پھوٹ پڑا ہے۔ موت آنکھوں کے سامنے کھڑی گھور رہی ہے۔ تم وہ غریب ہو جنہیں درندوں موذیوں اور قحط سے کہیں پناہ نہیں۔ امرا آرام سے گھروں میں سوتے ہیں۔ تم ہر وقت خوف کی حالت میں رہتے ہو۔ یہ عجب ملک ہے جہاں انسان کی جان کی قیمت موذی سانپ کے برابر ہے۔ اے میری طرح غریب سپاہیو! کیا مجھے پھانسی پر تڑپتا دیکھکر تمہیں رحم نہ آئیگا۔

سپاہی دل سے چاہتے تھے کہ خدا کرے رسّہ ٹوٹ جائے کہیں اسکی جان خلاصی پائے۔ بڑی تنخواہ کے افسر رحم کے مقابلہ میں اپنی تنخواہ کا پلڑا بھاری دیکھتے تھے۔ اس لئے پھانسی دی گئی۔ جب وہ پھانسی کا رسّہ چوم کر پھندا گلے میں ڈال کر جھول گیا تو اسکی تڑپ نے سپاہیوں کا دل تڑپا دیا۔ ان میں سے چند پکار اُٹھے کہ سانپ کے لئے انسان کی پھانسی بدترین قانون ہے۔ ان کے دل کا جوش عقل اور ہوش پر غالب آگیا۔ انہوں نے اپنے افسر پر ہی حملہ کر دیا۔ ایک دفعہ حملہ ہوا پھر حوصلہ بڑھ گیا۔ اب انہوں نے واضعانِ قانون کے گھروں کا رُخ کیا۔ جنہوں نے انسانوں اور حیوانوں کو برابر کی جان قرار دیا تھا۔ کچھ غیر ذمہ دار لوگ انکے ہمراہ ہو گئے۔ کچھ تماشائی پیچھے پیچھے چلے۔ اچھا خاصا ہجوم شہر کے بازاروں میں پھرنے لگا۔ بغاوت کا جوش اچھے بھلے آدمی کو مرضِ متعدی کی طرح لگ جاتا ہے، شریف سے شریف ہتین سے متین آدمی پگڑی بغل میں دبا کر مصروف ہا و ہو ہو جاتا ہے۔ سانپ موذی جانور مار دیئے جانے لگے۔ ان موذیوں کے ساتھ واضعانِ قانون کا بھی صفایا ہونے لگا۔ سانپوں کی تلاش میں لوگ اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ کئی ایک کو اس روز زہریلے سانپوں نے ڈس لیا جو جان بر نہ ہو سکے۔ ان کا جنازہ عاشق کے جنازے کی طرح بڑی دھوم سے نکلا۔ جب اشتعال انگیز حالات میں لوگ جمع ہوں تو جوش کا بھوت

انکے سر پر اور سوار ہو جاتا ہے۔ اب عوام کے جوش نے جنون کی صورت اختیار کی۔ انہوں نے واضعانِ قانون کے بچوں سے بھی بے رحمی کا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ شیر اور بھیڑیے جو ہر وقت بستیوں اور شہروں میں آکر انسانوں کی جان کے لاگو ہوتے تھے۔ انسانوں کے غصے سے ایسے مرعوب ہو گئے کہ کہیں نظر نہ آئے۔ سانپوں نے چوہوں کی بلوں میں پناہ لی۔

انسان محض جذبات کی مخلوق ہے۔ جذبات کو اُبھار دو وہ حقائق سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ ہجوم میں سے کسی دل جلے نے کھیتوں پر ایک رام گئو کو زخمی کر دیا۔ پھر کیا تھا طبیعتوں کا رُخ بدل گیا اور پرانے تعصبات عود کر آئے۔ گائے کا احترام عوام کے مذہب کی جان تھی۔ اب زخمی گائے کا جلوس شروع ہؤا۔ خیالات کا رخ بدلتے ہی زمانہ بدلا۔ اہنسا کے خلاف مظاہرہ کرنے والے اور واضعانِ قانون کو قتل کرنے والے اب تلاش کر کے قتل کئے گئے۔ تین روز کے بعد اب پھر حیوان اور انسان کی زندگی یکساں تصور ہونے لگی۔ زہریلے سانپ اور خوفناک درندوں نے اب پھر سر نکالنا شروع کر دیا۔ سانپوں کو ہر چند دودھ پلا کر دوست بنانے کی کوشش کی گئی مگر سانپوں نے ڈسنے کی خُو نہ بدلی۔ لوگوں نے شیروں اور بھیڑیوں کو ڈھول بجا کر ڈرانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ پھر پچھلا اہنسا کا دور جاری ہؤا۔ حیوان پر انسان قربان ہوتے رہے۔ اتفاق یہ ہؤا کہ

ایک بیوہ کے دو جوان بیٹے ایک شیر کی نذر ہوا دوسرا ناگ دیوتا کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بیوہ کی آنکھوں تلے دنیا اندھیر ہوگئی۔ دو جوان بیٹوں کی لاش پر کھڑی ہو کر اس درد سے روئی کہ سننے والوں کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ اس دردناک منظر سے متاثر ہو کر ایک نوجوان پکارا مارو ان بدمعاشوں کو جنہوں نے درندوں اور موذیوں کو انسان کے برابر قرار دیا۔ باقی تماشائیوں نے کہا ٹھیک ہے چل کر انہیں ٹھیک کرنا چاہئے۔ کیا ہوا اب ان لوگوں کی پھر شامت آگئی جو واضعان قوانین میں سے بچ رہے تھے ان کی صفائی کے بعد زخمی رام گنشو کا جلوس نکالنے والوں کا صفایا ہوا۔ پھر عوام الناس موذی جانوروں اور درندوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مارنے لگے۔ اس کوشش میں ہزاروں انسانی جانیں ضائع ہوئیں تب کہیں جا کر اطمینان کی سانس نصیب ہوئی۔ اب صرف گائے بیل اور دوسرے بے ضرر جانوروں کی افراط مصیبت ہو رہی تھی۔ گائے بیل تو مقدس سہی مشکل یہ پیش آئی کہ ہرن، مور اور نیل گائے بھی مقدس جانور شمار ہوتے تھے۔ ان سب نے مل کر کھیتیاں کھالی تھیں۔ لوگ فاقے کے باعث مرنے لگے تاہم ان کو مارنے کی کوئی جرات نہ کرتا تھا مذہب سے بڑھ کر اگر کوئی چیز انسان کو مجبور کرتی ہے وہ فاقہ ہے۔ سب نے ملکر یہ صلاح کی کہ قانون کی حرمت اور مذہب کی تقدیس بھی قائم رہے اور

کام بھی بن جائے اسکی صورت یہ ہے کہ ٹوٹے ہوئے بالنسوں سے مار مار کر ان جانوروں کو ریاست سے بھگا دو۔ ٹوٹے ہوئے بانس اس لئے استعمال کئے گئے تاکہ رام گائے کو چوٹ نہ لگے۔ مگر آواز زیادہ آئے تاکہ یہ ڈر کر بھاگ جائیں۔ چند روز میں آس پاس کی ریاستوں میں تباہی آگئی۔ وہ مجبور ہو گئے کہ اس تباہی سے ملک کا بچاؤ کریں۔ انہوں نے گائے بیل اور دوسرے جانوروں کو مار مار کر پھر اسی ریاست میں واپس کر دیا۔ اب جب نہ کھیتی کی امید رہی نہ گھر میں دانہ رہا، لوگ بالکل مجبور ہو گئے۔ بھوکے کا مذہب کیا؟ اب انہوں نے گروہ بنا کر رات کو باہر نکل کر رام گائے اور دوسرے جانداروں کا شکار کر کے بسر اوقات شروع کی۔ جس نے مذہب کے ان مخالفوں کو دیکھا بجائے ملامت کرنے کے وہ بھی شریک حال ہو گیا۔ وہ رام گائے جس کا زخم انقلاب اور قتل عام کا باعث ہوا تھا آج فاقہ کی مجبوری کے باعث مار کر کھائی جانے لگی۔ پورا ایک سال اس شکار پر بسر ہوا۔ حتیٰ کہ فصلوں کو برباد کرنے والے جانور ڈھونڈے سے نہ ملتے تھے۔

فاقے اور قحط نے لوگوں کا مذہب بدل دیا۔ اس ریاست کے لوگوں کے نزدیک کسی جانور کی تقدیس مسلم نہ رہی۔ پھر کبھی کسی نے نہ سنا کہ انسان حیوان کیلئے مارا گیا ہو۔

اندر بانے کہا فرحت۔ اسلام عوام کی بہتری کے لئے کیا مجلسی اور اقتصادی پروگرام رکھتا ہے۔

اسلام اخوت و مساوات کی اساس و بنیاد پر قائم ہے۔ برابری اور برادری کا یہ دعویٰ نہ صرف عبادات تک محدود ہے بلکہ اسکی سرحدات زندگی کے ہر شعبہ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلام نسب کے فخر و غرور کا مخالف اور سرمایہ داری کے برپا کردہ فتنوں کا دشمن ہے۔

اسلام نے دنیا میں دو حیثیتوں کو تسلیم کیا ہے۔ ایک کمزور دوسرا زور آور۔ کمزور کی حیثیت کو غیر مرئی طور پر محفوظ کر دیا ہے۔ عورت مرد کے مقابلہ میں کمزور ہے۔ عورت کا باپ کی وراثت میں بطور بیٹی کے حصّہ خاوند کی جائداد میں شادی پر مہر اور اس کی موت پر بجزہ مقرر کر کے عورت اور مرد میں اقتصادی مساوات قائم کر دی۔

اسی طرح فاتح اور مفتوح کے قوانین میں غلام کے حقوق خاندان کے افراد کے برابر کر دیئے اور ساتھ ہی غلام کو آزاد کرنے کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا تاکہ اسیرانِ جنگ کے ساتھ کوئی بدسلوکی ممکن نہ ہو سکے۔ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو تاج پہنا دے تو خدا خوش ہے۔ لیکن کوئی بدسلوکی کرے تو تعزیر ہے۔

اب سرمایہ دار اور غریب کو لو۔ سرمایہ دار پر کتنی پابندیاں ہیں

زکوٰۃ آمدنی پر نہیں لی جاتی بلکہ اصل زر کے حساب سے وصول کی جاتی ہے۔ جس کے پاس ۱۰۰ روپے سے زیادہ ہے وہ اسلام کے رو سے سرمایہ دار ہے۔ اس میں ۲½ فیصدی ایک سال غریب کے لئے کم از کم حصہ ہے۔ اگر غریب آبادی کی زندگی کے اسباب اس روپے سے پورے نہ ہوں تو حاکم کو کوئی امر مانع نہیں کہ وہ امرا کی جائداد سے جو چاہے وصول کرے۔ سرمایہ دار کی حفاظت مذہب یا قانون کا فرض نہیں ہے۔ بلکہ سوسائٹی کی حفاظت سب سے اہم فرض ہے۔ سُود کی حرمت اسی لئے ہوئی کہ سرمایہ دار غریبوں کو غلامی کی زنجیروں میں نہ جکڑ سکے اور سوسائٹی میں امیر اور غریب کا قابلِ ذکر امتیاز پیدا نہ ہو۔

اسی اسلام کے اقتصادی اصولوں نے واضح کر دیا کہ زمین اور دولت خدا کی ملک ہے۔ غریب کے لئے جو وصول کیا جاتا ہے وہ رحم رعایت یا احسان نہیں بلکہ اس کا حق ہے۔ حاکم کا فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ دنیا کی دولت کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ اکٹھی نہ ہو۔ اگر ایسی صورت ہو تو وہ جائداد کو بحق سرکار ضبط کرنے کا حقدار ہے۔ جب حضرت عمر نے خالد بن ولید کی نصف جائداد اس جرم میں ضبط کر لی کہ تم سرمایہ دار ہو گئے ہو اور خالد بن ولید جیسے جلیل القدر صحابی کے اعتراض کی بھی دربارِ خلافت میں کوئی شنوائی نہ ہوئی تو بہ دیگراں

چہ رسد۔

اندرما اسلام کو روس کے اقدامات سے کوئی خوف نہیں۔ بلکہ اس کا اقتصادی پروگرام اسلامی پروگرام ہے۔ سوویٹ روس سرمایہ دار کے مقابلہ میں غریبوں کا حامی ہے۔ ان کا اصول مساوات اسلامی شریعت سے ماخوذ ہے۔ اسلام سے پہلے صنفِ نازک کی حالت ذلیل تھی۔ غلام پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ غریب کی دنیا تاریک تھی۔ اسلام نے دنیا کو مساوات کی بنیاد پر نئی تعمیر کی دعوت دی۔ روس کے اقدامات اُس اسلامی دعوت کی تجدید ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مساوات کی جزئیات کے بارہ میں روس نے ابھی اسلام سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

اندرما نے کہا فرحت۔ مسلمان ہی تو رُوس سے زیادہ خوفزدہ ہیں

فرحت۔ وہ خوفزدہ کر دیئے گئے ہیں۔ سرمایہ دار حکومتوں نے جب یہ دیکھا کہ روس کی تحریک اسلام کی قوتِ عمل سے مل کر سرمایہ داری کا خاتمہ کر دے گی۔ اور نسلِ انسانی میں یتیم مکہ کا پیغامِ مساوات تشنۂ تکمیل نہ رہے گا تو انہوں نے مساوات کے دو خواہشمند گروہوں کو جدا رکھنے کیلئے سارا زور صرف کر دیا۔

اندرما۔ تو کیا اسلام کے اقتصادی پروگرام اور روس کے اقتصادی پروگرام

میں کوئی فرق نہیں۔

فرحت۔ روس کا پروگرام صرف مساوات کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسلام کا پروگرام اخوت اور مساوات دونوں پر قائم ہے۔ یعنی اسلام محبت کی بنا پر انقلاب چاہتا ہے۔ روس سرمایہ دار کی نفرت دلا کر کایا پلٹنا پسند کرتا ہے۔ اسلام آخرت کی خوشگوار امید دلا کر سرمایہ دار کو سرمایہ سے دستبردار ہونے کی تحریک کرتا ہے۔ اس طرح کام نہ بنے تب قانون کو کام میں لاتا ہے۔ روس چھٹتے ہی سرمایہ دار کا سر سپرد دار کر کے مال کو خوان یغما سمجھ کر لوٹتا ہے۔ اور اسے خود اصلاح حال کی مناسب مہلت نہیں دیتا۔ دونوں کے سامنے بہر صورت یہ مقصد ہے کہ دنیا سے سرمایہ داری کا نظام تباہ ہو اور بنی نوع انسان میں مساوات قائم ہو۔ اسلام نے صرف حکیمانہ انداز اختیار کیا ہے۔ مساوات کو اخوت کے ساتھ شامل کر کے تلخی کو خوشگوار بنا دیا ہے۔

فرحت پر اندرما کا اعتقاد اور اعتماد دن بدن بڑھتا جاتا تھا۔ باوجود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے وہ فرحت کو علم میں ہمہ دانہ سمجھتی تھی بلکہ اکثر اوقات سچے شاگرد کی طرح مؤدب بیٹھ کر بعض مسائل دریافت کرتی۔ اس گفتگو کے بعد فرحت محسن اور اندرما بازار میں گھومتے گئے۔ دیواروں پر اشتہار چسپاں تھے "کانگرس اور مسلمان" کے موضوع مناظرہ کا اعلان تھا۔

دوسرے روز صبح اندرما کو شرارت سوجھی کہ فرحت کی اطلاع کے بغیر محسن سے مشورہ کرکے منتظمین مناظرہ کے پاس پہنچی اور انہیں اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ فرحت کی تقریر کے لئے بھی وقت رکھیں۔ فرحت کو مناظروں کا ذوق نہ تھا لیکن وہ محسن اور اندرما کے اصرار پر مناظرہ سننے کے لئے ساتھ ہولیا۔ اسکے وہم میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ بھی مناظرین کی فہرست میں ہے۔ جب جلسہ گاہ میں پہنچے تو منتظمین نے اندرما کو پہچان کر خوش آمدید کہا۔ اندرما نے فرحت کا تعارف کرایا کہ یہ جہاں دیدہ نوجوان فرحت ہے۔ سب نے فرحت سے گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ فرحت کو انکے تپاک سے حیرت سی تھی۔ الغرض مناظرہ شروع ہوا۔

اسلام کی نمائندگی کرنے والوں نے ہندو اکثریت کا خوف دلایا۔ سپین میں اسلام کے حشر کا رونا رو کر رقّت پیدا کردی۔ مذہب اور کلچر کے فنا ہونے کا خدشہ ظاہر کیا۔

ہندوستان کا غلام مسلمان تو جذبات کی مخلوق ہے۔ تقریروں کی رو میں بہ گیا۔ سپین کے حشر اور اپنے تاریک مستقبل کے خوف سے کانپ گیا۔

اتنے میں صدر جلسہ نے اعلان کیا کہ علّامہ فرحت صاحب تقریر فرمائیں گے۔

فرحت اس غیر متوقع اعلان پر حیران سا ہوا اور بوکھلا سا گیا۔

پریشان ہوکر ادھر اُدھر دیکھا۔ اندرما نے شانے پر ہاتھ رکھکر کہا فرحت با!
تمہیں ضرور اظہارِ خیال کرنا چاہئے۔ محسن بولا، اب تو کچھ کہنا ہی پڑیگا۔
لوگوں نے اس تذبذب سے یہ سمجھا کہ علّامہ موصُوف کسر نفسی فرمارہے ہیں۔
انہوں نے تالیاں بجاکر اظہار شوق کیا۔ فرحت ورطۂ حیرت سے نکلا اور
سنبھلا۔ بادلِ ناخواستہ اُٹھا۔ یہ نوخیز علّامہ لوگوں کی نظروں میں نہ جچا۔
لیکن خاموش بیٹھے رہے کہ اور نہ ہوگا تو اس مفرر کی بدحواسیوں سے ہی
لطف اٹھائیں گے۔

فرحت نے ایک منٹ اپنے حواس کو درست کرنے میں لیا۔
طبیعت میں ذرا سکون پیدا ہوا تو بسم اللہ کہہ کر تقریر شروع کی۔

صاحبِ صدر۔ محترم خواتین معزز حاضرین۔

قوموں کی قسمت کا فیصلہ نظام اور اسباب پر منحصر ہے۔ کثرتِ تعداد بعض اوقات کمزوری کا باعث بن جاتی ہے۔ اس لئے سیاسئین کو کثرت وقلت کی بحث کو چھوڑ کر نظام اور اسباب کی بنا پر مسلمانوں کی سیاسی پالیسی کا مدار رکھنا چاہئے۔ مٹھی بھر اسلامی فوج فتح کے پھریرے اُڑاتی ہوئی آپہنچا جاتی ہے۔ ہندوستان کی کثیر آبادی مسلمان فاتحین کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ مصر اور ایران کی فوجیں حجازی سالاروں کے سامنے خاک چاٹتی ہیں۔ آج ۳۰ کروڑ ہندوستانی کس طرح چند لاکھ انگریزی نفوس کے سامنے

عجز و انکسار کی تصویر بنے غلامی کا طوق گردن میں ڈالے ہوئے ہیں۔ نظام اور اسباب کی کمی کے باعث ہندوستان بے بسی کی بدترین مثال پیش کر رہا ہے۔ سات کروڑ مسلمان اگر آزادی کی آگ سینہ میں لے کر اُٹھیں تو دنیا کو زیر و زبر کر دیں۔ مگر عمل سے عاری مسلمان گفتار کے غازی بن کر قانونی موشگافیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ آزادئ وطن کے خلاف خُود کوئی حجت کھڑی کر کے تمام دنیائے اسلام کی مصیبتوں کا باعث بنتے ہیں وسعتِ نظر اگر حالات کی جانچ اور پڑتال میں یاوری کرے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی قلت بھی محض اصطلاحی سی بات ہے۔ ورنہ لاہور سے استرخان تک مسلمان آباد ہے جس کی قوت کے سامنے جنوبی ہند کی تعداد آبادی زیادہ قوت نہیں رکھتی۔ ہندوستان میں اسلام اور مسلمان کیوں خطرے میں ہے۔ کیا ایران، افغانستان، ترکی، روس، میں اسلام کے نام لیوا مسلمان آباد نہیں۔ اسلام اور مسلمان کے خطرے کی بحث میں صرف ہندوستان تک محدود کیوں رہتے ہو۔ اگر ہندو مسلمان کی بحث ہے تو لاہور کے اوپر روس تک کے مسلمان اور لاہور کے نیچے راس کماری تک کے ہندو کا سوال ہے۔ خوف کا مقام ہندو کے لئے ہے یا مسلمان کے لئے۔ پنجاب، سندھ اور سرحد کے مسلمان اپنی قدرتی حیثیت کو نہیں سمجھتے کہ وہ ایشیا کے جنگجو مسلمانوں کا دروازہ روکے کھڑے ہیں۔

یہ تو کھلی جنگ کی صورت ہوئی۔ اب اگر آئینی کشمکش تک بات محدود رہے تو بھی قدرت نے ہمیں زیادہ کمزور نہیں رکھا۔ اگر سرحد، سندھ، پنجاب اور بنگال میں اسلامی آئینی حکومت مان لی جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کی حکومت میں ہندو رعایا کی تعداد زیادہ ہے۔ اور ہندو اکثریت اور حکومت کے صوبوں میں مسلمان کم بستے ہیں۔ اگر ہندو اپنے اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو تنگ کرینگے تو اسلامی اکثریت کے صوبوں میں زیادہ تعداد میں ہندو ہی تکلیف اٹھائینگے۔

یہ بحث میں نے مسلمانوں کے ذہن کو صاف کرنے کے لئے کی ہے۔ کیونکہ مسلمان ہی ہے جو ہندو اکثریت کے خوف سے مرا جاتا ہے ورنہ حقیقت میں یہ تصوّر ہی شر انگیز ہے۔ اگر ہندوستان کے بسنے والے ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم رہے ہے تو غلامی کا پٹہ ہمارے گلے میں پڑا رہے گا۔ دو قوموں کے لیڈروں کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ وہ اپنی اپنی قوم کو علیحدہ علیحدہ مضبوط ہونے کا مشورہ دیں۔ یہی آواز متحدہ قومیت کیلئے مہلک ہوگی۔ ایک ملک میں دو مسلح گروہ امن کی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ نہ تیسری قوت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس تیسری قوت کا صرف اتنا کام ہے کہ چند آدمیوں کو قابو میں رکھ کر دو مسلح اور متحارب گروہوں میں بد اعتمادی پھیلاتی رہے۔ اور خود امن اور چین سے حکومت کرے۔

بہت سے مخلص مگر تنگ دل لیڈر ایسے نکلتے رہیں گے جو دیانت داری سے اپنے مخصوص فرقہ کی خدمت اور تنظیم کا جذبہ لے کر اٹھیں گے۔ اس جذبہ لے کر اٹھیں گے۔ اس جذبہ کی تکمیل کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہ کرینگے مگر ان کی ساری قربانیاں انگریز کے کھیت کی کھاد ہو گی۔ کیونکہ ضمنی فائدے کے لئے اصل فائدہ برباد ہو جائے گا۔ غلام ملک کی بہبودی آزادی حاصل کرنے میں ہے۔ فرقہ دارانہ تنظیم میں دوسری ہمسایہ قوم کے مقابلہ اور مخالفت کا غیر مرئی جذبہ پیدا ہوتا رہتا ہے جو دو قوموں کے مل بیٹھنے کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم میں علیحدہ تنظیم کا غلغلہ بلند ہوا۔ دوسرے فرقے میں بھی شور پیدا ہو گیا یا پیدا کر دیا گیا۔ اب فرقہ وار تنظیم کی دونوں طرف زور شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس کے بعد تعزیہ پر ایک اینٹ، مسجد میں سور کا گوشت، مندر میں گائے کی ہڈی پھینک کر سارا ملک جہنم کدہ بنانے کے لئے کافی ہے۔ پھر تو اسلام خطرہ میں ہندو دھرم خطرہ میں کا شور اٹھتا ہے۔ بے گناہوں کے خون سے زمین لالہ زار ہوتی ہے۔ حکومت کمال مہربانی سے جلسے جلوس بند کر دیتی ہے۔ ملک میں امن قائم ہو جاتا ہے۔ یہ ہوتا ہے فرقہ وار تنظیم کا حشر۔ علیحدہ علیحدہ تنظیم نے اہل ملک کی فرقہ وار حس کو ایسا لطیف کر دیا ہے کہ ایک کلمۂ بد زبان سے نکلتا

پیچھے سے قتل پہلے شروع ہو جاتے ہیں۔ معابد کی تعمیر پر مہینوں قتلِ عام ہوتا ہے لیکن فرقہ وار بھوت کی پیاس پھر بھی نہیں بجھتی۔ حریت کا جذبہ سالوں کے لئے فنا ہو جاتا ہے۔ کسی کو آزادی کا لفظ منہ سے نکالتے بن نہیں آتی۔ علیحدہ تنظیم کے مدعی ملک کی مستقل نامرادی ہیں اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کے تصوّر کو بتدریج دماغوں سے محو کیا جائے اور "مذہب کو خطرہ" کے بلند بانگ دعووں کو حق اور انصاف، دلیل اور برہان سے دبا دیا جائے۔

ایک آواز:۔ گویا مذہب کو نظر انداز کر دیا جائے۔

فرحت۔ معترض دوست مذہب تو ہم نے اب بھی نظر انداز کیا ہوا ہے اسلام میں سود حرام ہے۔ یہ سود خوری جاری ہے۔ شراب خانے بدکاری کے اڈّے فروغ پا رہے ہیں۔ شریعت کے مطابق وراثت کی تقسیم بروئے قانون ممکن نہیں۔ غرض جو چیز حکومت کو پسند ہے وہ مذہب ہے، جو چیز شریعت کو ناپسند ہے اس کا رواج ہے۔ پھر بھی تم مسلمان ہو اور مذہب خطرہ میں نہیں مسجد کے سامنے باجا نہ بجنے پائے تعزیہ گذارنے کے لئے پیپل ضرور کاٹا جائے۔

اور آواز:۔ ہندو کا طرزِ عمل کیا ہے۔

مَیں ہندو کے طرزِ عمل کو مستحسن نہیں سمجھتا۔ اس کی حالت مسلمان

سے بہتر نہیں۔ اسے مسجد کے سامنے باجا بجانے پر اصرار ہے۔ راستہ رک جائے مگر پیپل کا پتہ نہ ٹوٹنے پائے۔ غرض ہندو مسلمان دونوں کا مذہب اپنی اپنی عداوت کو پورا کرنا ہے۔ اس لئے دونوں قوموں کے افراد کو سوچنا چاہئے وہ کیا کر رہے ہیں۔ ہندوستان کو جب آزادی ملے گی تو مذہب کو بڑا سے بڑا خطرہ بھی اس وقت کے خطرہ سے زیادہ نہیں۔ مذہب کی وہ رسم جو انگریزی سیاسیات سے ٹکرائے گی فنا کر دی جائے گی۔ پس ہندوستانی کا مذہب وہ ہے جس کی حکومت اجازت دے۔ اگر ایک صدی سے یہ صورت ہندو مسلمان دونوں کے لئے قابلِ برداشت رہی ہے تو آئندہ کی کیا فکر ہے۔ اس سے بدتر صورت اور کیا ہوگی۔ دنیا کی کوئی پاگل حکومت ایسی ہوگی جو ان لوگوں کی مخالفت کرے جو اپنی رائے اور طبیعت کو ہندوستانیوں کی طرح حکومت کی رائے کے سانچے میں ڈھال لے۔ ہم مذہب کے مدعی تو اپنے مذہبی احساسات کو انگریز کی خوشنودی پر قربان کرنے کے عادی ہیں۔ حکام کی رائے کے مطابق بدلنے والے مذہب کو کہیں خطرہ نہیں۔ جب ہم انگریز کو والی الامر مان سکتے ہیں تو آئندہ کسی حکومت سے ہمارے تابع فرمان مذہب کو اندیشہ نہیں۔ اسلام میں جہاد سب سے بڑی عبادت تھی اور سب سے مقدم حکم تھا۔ ہندوستان میں ایسے عالم ایسے مصلح ایسے نبی

پیدا ہو گئے جنہوں نے انگریز کی خوشنودی کے لئے جہاد کو منسوخ قرار دیا اور تمام مسلمانوں نے اپنے سکوت سے اس تنسیخ کی تائید کی اگر اس وقت مذہب خطرے میں نہیں تو مذہب کو آئندہ اس سے زیادہ کبھی بھی کوئی خطرہ نہ ہوگا۔

مذہب کے ساتھ ساتھ کلچر کا بھی ذکر کردوں معلوم نہیں کہ یہ کلچر کیا بلا ہے جس پر مسلمان بعض اوقات بے جا اصرار کرتے ہیں۔ اگر مذہب زندہ ہے تو مذہب ہی کلچر ہے۔ جہاں مذہب مر جائے تو قوموں کی آبا و اجداد کی رسومات کا نام کلچر ہے۔ مسلمان ہیں کہ ایک طرف رسُومات کی بیخ کنی اور دوسری طرف کلچر یعنی رسُومات کے تحفظ پر زور دے رہے ہیں۔ اسلام تو بجز حکم شریعت کسی اور کلچر یا رسم کا متحمل ہی نہیں۔ خدا معلوم پھر اسلامی کلچر کو خطرہ کا خیال ہوا بن کر کہاں مسلمانوں کے سامنے آگیا سب سے مزیدار بات یہ ہے کہ مذہب اور کلچر کے خطرے کا الارم وہ دیتے ہیں جنہیں اسلامیات سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔

عزیزو ہندو ہو یا مسلمان ایک بات کو یاد رکھو کہ مذہب کو ان اہلِ مذہب سے خطرہ ہے جو ان کو اپنے اغراض اور غیر ملکی ایجنسیوں کی ضرورت کیلئے استعمال کر کے اہلِ ملک کی مصیبت کا باعث ہو رہے ہیں علما اور صُوفیا کا کام غریب اور بے کس کی حمایت ہے۔ جب شریعت اور طریقت

کے یہ رہنما سرمایہ دار کی طرفداری کر کے غریب کی دُنیا اور تنگ کرنے میں مدد دیں۔ تو ایسے اہلِ مذہب کے مٹ جانے پر کون افسوس کرے۔ مذہب ہر چند روح کی تسکین کا باعث ہے لیکن روس میں فنا ہو گیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ نام نہاد مذہبی ادارے غریب کُشی میں سرمایہ داری کے ممد و معاون تھے لیکن رُوس میں مذہب اور خُدا سے انکار عارضی کیفیت اور مذہبی پیشواؤں کی غلط روی کا ردِ عمل ہے۔ رُوس کے الحاد میں مجھے اسلامی معتقدات کی جھلک نظر آتی ہے۔ رُوس کا مجلسی اور اقتصادی پروگرام اسلام کے نظامِ معاشی سے بہت ملتا جلتا ہے۔ جب رُوس میں مذہب کے خلاف بخار اُتر جائے گا تو روسی قوم حجازی دین کے بہت قریب ہو جائیگی۔

تم مانتے ہو کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اگر تمہیں اس بات پر یقین ہے تو فطرت کے خلاف کون جا سکتا ہے۔ یا تو تمہارا دعوٰی غلط ہے یا خطرہ موہوم ہے۔ اسلام کو کسی سے خطرہ نہیں محض مسلمانوں سے خطرہ ہے جن کا دل و دماغ غیر اسلامی تصورات کا حامل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم ہمسایہ ہمیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور خوف و ہراس سے ہماری حرکات پر نگاہ رکھتا ہے۔ ایسا کیوں ہے یہ صرف اس لئے کہ دینِ فطرت کو دوسروں کی دست برد سے بچانے کے ہم ہمیشہ درپے رہتے

ہیں۔ اور نہیں سوچتے کہ فطرت نوازل سے ابد تک محفوظ ہے اسکو کون مٹا سکتا ہے۔ دینِ فطرت کے مطابق ہمارے اخلاق اور اعمال ہونے چاہئیں پھر خود ہی قومیں فطرت کے دین کی طرف کھچی چلی آئیں گی اور ہمیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھیں گی۔

غلامی قوم اور ملک کی سب عمدہ خصوصیات کو فنا کرنے والی اور اہلِ ملک کو اقتصادی لوٹ کھسوٹ کا مقابلہ کرنے کے ناقابل بنانے والی ہے۔ ہماری ساری توجہ آزادی کے حصول کی طرف ہونی چاہئے۔ اگر ہم نے موہوم خدشات و خطرات کو سامنے رکھنا ہے تو ہمیں غلامی پر قانع رہنے کا اعلان کر دینا چاہئے۔ جو انسان غلامی کے خطرات کی اہمیت کو ہی محسوس نہیں کرتا اُس کے لئے کسی اور خطرے کا ذکر کرنا ہی دیوانگی ہے۔ جو موت قبول کرنا چاہتا ہے وہ بخار سے کیوں ڈرتا ہے۔ جو غلامی پر قانع ہے اور آزادی کو انسان کا سب سے بڑا حق ہے چھوڑتا ہے وہ چھوٹے چھوٹے حقوق کے لئے کیوں لڑتا ہے۔ طاقت اور قوت کا مخزن سیاسی آزادی ہے۔ جو قوم اسکے حصول سے لاپروا ہے وہ مذہب کے خطرے اور اقتصادی تباہی کا رونا کیوں روتی ہے۔

میری سمجھ میں سوائے اسکے کوئی بات نہیں آتی کہ بلا خوف و خطر اہلِ وطن سے مل کر آزادی کی جنگ لڑی جائے اور اگر کچھ امتیاز رکھنا ہی

ہے تو ہندوستان کی تمام قوموں میں نیکی خدمت اور قربانی میں ممتاز ہونے کی کوشش کرنا چاہئے۔ بجائے علیحدہ تنظیم کے جو آزادی کی جنگ کو دُور ڈال دے، مناسب یہی ہے کہ آزادی کے لئے قدم اٹھانے والے گروہ کا سردار ہو۔ تم ملک کے بہتر باشندے بن کر غلام قوم کی رہنمائی کرکے آزادی کی منزل تک کیوں نہیں لے جاتے وکنتم خیرامۃ یدعون الی الخیر کے کیوں مصداق نہیں بن جاتے۔ آزادی سے بڑی خیر اور کیا ہے۔ اس کی طرف سب کو دعوت دینا تو مسلمان کا فرض ہے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ مسلمان ہی تحریکِ آزادی میں شمولیت کی شرائط پیش کرتا ہے۔ حالانکہ اسے خود پیش قدمی کرنا چاہئے۔ دوسرے حجت لگائیں تو ان کو محبت سے سمجھا کر ساتھ لینا چاہئے تھا۔ خیر الامت سے ارذل امت کے سے افعال سرزد ہو رہے ہیں۔ مگر وہ پاک دعوے کی دلیل کے طور پر اپنے اعمال و افعال کی اصلاح نہیں کرتی۔

اسلام امن و صلح کا مذہب ہے، اس لئے مسلمان کا فرض ہے کہ ہندو صلح اور امن نہ بھی چاہے تو بھی وہ حالات پیدا کرے کہ ملک میں امن اور صلح قائم رہے۔ دُنیا پکار اُٹھے کہ ہماری زیادتیوں کا جواب صبر و تحمل سے دینے والے اگر ہیں تو مسلمان ہیں۔

مسلمانو! اپنے مذہب کے پیغام کو سمجھو اور اس کو لے کر دنیا میں نکلو

اللہ نے دینِ اسلام کو اس لئے پسند فرمایا تاکہ اسکے ذریعہ جنگ اور لڑائی سے ستائی اور اکتائی ہوئی دنیا کو امن وصلح کا موقعہ مہیا کیا جائے۔ مسلمان کی زندگی کا مقصدِ وحید خدا کی مخلوق کو فائدہ پہنچانا ہے۔ غلام خود عاجز اور بیکس ہوتا ہے وہ دوسروں کی کیا مدد کرے گا۔ اس لئے مسلمان کا مقدم فرض یہ ہے کہ وہ خود آزاد ہو اور شریف ہمسایہ بنے۔ میں یہ شرم سے محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان نے اسلام کے پیغام کو سمجھے بغیر بزعمِ خود نیکیاں کرتا ہے اور بعض اوقات اپنی تنگ دلی سے ہمسایہ کو کبیدہ خاطر کر لیتا ہے سچ تو یہ ہے کہ قوم کی قوم اسلام کے پیغام سے غافل ہے۔ اور انہوں نے شیطانی وسوسے کو اسلام کا پیغام سمجھ رکھا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان کی زندگی کا محور ہمسایہ نوازی اور مخلوق کی خدمت ہو۔ قرآن نے بار بار سمجھایا کہ اس دین میں جبر نہیں۔ مسلمان کے لئے جنگ بھی اضطراری کیفیت ہے۔ پیغمبرِ خدا تو سرخ اونٹ دے کر بھی ہمسایہ سے صلح کو قابلِ فخر سمجھتا ہے۔ وہ تو اس شخص کے حق میں بہتر انسان ہونے کا فتویٰ دیتا ہے جسکی ذات سے بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچے۔

دنیا میں مسلمان کی سیاست یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں قرآن کی امن پسندانہ تعلیم کو لے کر نکلے۔ دوسرے ہاتھ میں آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے تلوار کو مضبوط تھامے رہے۔ جہاں تک ممکن ہو ہمسایہ کی زیادتیوں کا جواب بھی

اخلاقِ محمدی سے دے۔ اشتعال انگیز حالات میں بھی اسلامی تعلیم و اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

پس مسلمان سے میری گذارش یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں آزادی کی جنگ کا سردار ہو اور ہمسایہ کے دل میں رفع شک کے لئے نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق اپنی زندگی کا مقصد مخلوقِ خدا کی خدمت بنا لے۔ بجائے علیحدہ تنظیم کی رٹ لگانے کے مشترکہ تنظیم میں ایسی جگہ پیدا کرے کہ مسلمان ہر عمدہ تحریک کا قدرتی راہنما نظر آئے۔ اگر ہندوستان میں بسنے والی قوموں کی سرگرمیوں کا مقصد مشترک بھی خدمتِ خلق ہو جائے تو ہندوستان جنت نشان سمجھا جائے۔ علیحدہ تنظیم کا خیال سم قاتل ہے۔ البتہ خدمتِ خلق میں سبقت ساری مشکلات کا حل ہے جو مذہب یا فرقہ جنگِ آزادی اور خدمتِ خلق میں بڑھ جائیگا وہ قدرتی طور پر زیادہ منظم سمجھا جائیگا۔ اور اس کا نظام نہ کبھی بارِ خاطر ہوگا نہ آزادی کے راستے میں رکاوٹ۔ اس لئے مسلمانوں میں اس خیال کی اشاعت کرنا چاہئے کہ وہ جنگِ آزادی میں سردار ہو اور مخلوق کی خدمت کے لحاظ سے سب سے ممتاز ہو۔ اگر مسلمان یہ دو امتیاز پیدا کرے تو اس کی برتری مسلّم ہو جائے گی۔ خدا بھی خوش اور ہمسایہ بھی راضی۔ ایسا گروہ قلیل ہوتا ہوا بھی کثیر کا حکم رکھتا ہے۔ علیحدہ علیحدہ تنظیم کا خیال ہندوستان کی بربادی کا باعث ہوگا۔ البتہ خدمت اور قربانی

میں سبقت کا ارادہ ہر طرح بابرکت ثابت ہوگا۔

مسلمانو! خدارا ہندوستان میں اپنی قلت اور عدم تنظیم کا رونا رو کر عمر ضائع نہ کرو۔ بلکہ اپنی آئندہ نسل میں ہندوستان کی مشترکہ تنظیم میں سردار بننے کا خیال پیدا کرو۔ نیکی کے کام میں مسلمان پسماندہ ہو یہ اسلام پر کتنا بڑا الزام ہے۔ یاد رکھو میرا یہ پیغام ہندوستان کیلئے نہیں۔ بلکہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے ہے کہ وہ بنی نوعِ انسان میں مشترکہ تنظیم پیدا کر کے آئے دن کی جنگ کو روک دیں۔ اور خود دنیا کی مشترکہ تنظیم کا راہنما مسلمان ہو۔ تاکہ غریبوں اور کمزوروں پر ظلم ممکن نہ ہو سکے۔ اور دنیا امن اور آشتی کے راستہ یعنی اسلام پر چلتی رہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان نے بھی دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی اپنے عالمگیر مذہب کو محدود شکل میں پیش کیا ہے۔ چند عقاید و عبادات کا نام اسلام نہیں بلکہ یہ تمام بنی نوعِ انسان کی مشترکہ تنظیم کا مدعی ہے۔ اور مسلمان زیادہ سے زیادہ اپنی کوشش اور خدمت کی بنا پر قدرتی رہنما کی حیثیت سے دنیا میں بسر کرنا سکھلاتا ہے۔

عزیزو! مسلمان کوئی کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر للکاروں اور کس طرح صور اسرافیل پھونک کر اسلام کا صحیح پیغام سناؤں اور کیا جتن کروں کہ مسلمان کے یہ امر ذہن نشین ہو جائے کہ ہندوستان نہیں بلکہ دنیا میں

بنی نوعِ انسان کی مشترکہ تنظیم میں خدمت اور قربانی کی بنا پر سرداری حاصل کرنا اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ فراستِ مومن کہاں گئی کہ مسلمان راستے سے بھٹکا جا رہا ہے کہ وہ کیوں اسلام کے ظاہری معنوں پر غور کر کے ہی خود امن و آشتی کا پیغام نہیں بن جاتا۔ اٹھو! علیحدہ تنظیم کی رٹ چھوڑ کر ہندوستان کی مظلوم اور غلام قوموں کی مشترکہ تنظیم کا خود بیڑا اٹھاؤ۔ اگر وہ زیادتی کریں تو صبر کرو۔ عزیز ہمسایہ کے پیارے بھائی بن کر ان سے استخلاصِ وطن کا کام کرو۔ آزادی کے لئے اتنی قربانی کرو اور اہلِ وطن کی اتنی اور ایسی خدمت کرو کہ وہ ہر مصیبت میں پکار اٹھیں کہ مسلمان کہاں ہیں۔

اس مختصر کلام کے بعد فرحت بیٹھ گیا۔ لوگ عزت و احترام کے جذبات لے کر اُٹھے۔ جب مجمع منتشر ہوا تو اہلِ دل اس امر کے قائل تھے کہ ہندوستان کی آزادی اور مسلمان کی نجات اسی میں ہے کہ وہ اپنی قربانی اور ایثار کی بنا پر ملک کی ساری قوموں کی سرداری کی سعی کرے۔ ورنہ فرقہ دارانہ تنظیم فرقہ دارانہ تنظیم پیدا کرے گی۔ اس کے نتیجہ کے طور پر فرقہ دارانہ فساد ہونگے۔ دشمنانِ وطن کے گھر میں گھی کے چراغ جلیں گے۔ قربانی اور ایثار کی بنا پر امتیاز حاصل کرنا مذہب کا بہترین نصب العین ہے۔

اندرما کبھی آج سے زیادہ خوش نظر نہ آئی تھی۔ وہ فرحت کے حبِّ وطن اور خدمتِ خلق کے تصوّر سے نہایت مطمئن تھی۔ وہ دل میں کہتی تھی کہ اگر کوئی ہندوستان کا مذہب یا فرقہ یا گروہ ایثار اور خدمت کی بنا پر ملک میں شہرت اور امتیاز پیدا کرنا چاہے تو یہ قابلِ قدر جذبہ ہے۔ خدمت میں عظمت کا اصول ایسا اصول ہے جسکی ہر شریف انسان قدر کرے گا۔ خادم کو ہی مخدوم ہونے کا حق ہے۔ اندرما نے فرحت کا ہاتھ محبت اور عقیدت سے دبایا۔ اور عزت و احترام سے اس کو دیکھا اور تینوں اندرما محسن اور فرحت گھر کو لوٹے۔

عزمِ سفر

عزمِ لداخ کے سلسلہ میں تیاریاں مکمل کر لی گئیں اور وہ لاہور سے روانہ ہو کر سری نگر پہنچے۔ ادھر اُدھر کی سیر کی اور چند دن سری نگر رہ کر لداخ چلے گئے۔ لداخ میں لوگوں نے برف سے ڈھکے پہاڑوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ ان پہاڑوں کو مقدس خیال کیا جاتا ہے اور ان کے متعلق عجیب و غریب روایتیں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں ہزارہا سال کی عمر کے زندہ انسان موجود ہیں۔ وہ گرمی سردی سے بے نیاز عبادت میں مصروف ہیں۔ انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں

کوئی وقت نہیں ۔ زمین ان کے پاؤں میں سمٹ آتی ہے ۔ اس طرح وہ بغیر سفر کی زحمت اُٹھائے ہر ملک میں آسانی سے پہنچ جاتے ہیں لیکن ان کی ہوش میں ان بلندیوں پر کوئی نہیں پہنچا ۔ جس نے کوشش کی ناکام رہا ۔

لداخ میں ہی قیامت کی سردی تھی ۔ برف پوش پہاڑوں کی چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کرنا دیوانگی سے کم نہ تھا ۔ جب لوگوں نے ان تینوں کے عزم کا حال سنا تو وہ ہنسے کہ جس موسم کو ہم خوشگوار سمجھتے ہیں تم اس میں مرے جاتے ہو ۔ اور جن بلندیوں پر جا کر ہمیں زندگی کی امید نہیں تم کیسے سلامت پہنچو گے ۔

محسن کو لوگوں کی رائے بہت معقول معلوم ہوتی تھی مگر شہزادی نیلوفر چشمِ تصوّر کے سامنے سرتاسر صورتِ التجا بنے آکھڑی ہوتی ۔ اور کبھی کہتی کہ بس یہی ہمّتِ مردانہ ہے ۔ اس طرح محسن کے لئے عزم بلند کرنے کے بغیر چارۂ کار نہ تھا ۔ اس کی خواہش ہوئی کہ اندرا اور فرحت لداخ سے آگے نہ جائیں ۔ وہی اکیلا قسمت آزمائی کرے ۔ چنانچہ اس نے رات کے وقت آگ تاپتے ہوئے کہا کہ دیکھو عزیزو! منزل کٹھن اور راستہ معلوم نہیں ۔ مَیں ایک وعدے کی بنا پر مجبور ہوں ۔ مَیں تو جان پر کھیل کر بھی قول نبھاؤنگا تمہیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ میرا اس سے آگے ساتھ دو ۔ تم یہیں

پڑے رہو یا لوٹ جاؤ۔ بلا وجہ جان کو جوکھوں میں ڈالنا معقول بات نہیں۔ جیتا آؤں گا تو مل لوں گا۔ ورنہ دعا سے یاد کرنا۔

اندرما کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ فرحت کچھ کبیدہ سا دکھائی دیا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ محسن میں پہاڑ پر چڑھائی کا وہ ولولہ نہیں جو کامیابی کا کفیل ہو۔ اس لئے اس نے کہا شاید آپ کو یہ مہم بڑی معلوم ہوتی ہو میں تو اسے قابلِ تردد بات ہی نہیں سمجھتا۔ اندرما کے متعلق البتہ خیال ہے کہ انہیں لداخ سے آگے ہرگز نہ بڑھنا چاہیئے۔

اندرما نے اب محسوس کیا کہ مجھے کمزور دل عورت سمجھ کر وہ میری فکر میں مبتلا ہیں۔ یہ جنسی فوقیت مرد کی کمزوری ہے۔ مجھے ان کی کمزوریوں کو نظر انداز کر کے شانہ بشانہ مصائب کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ انہیں کیا معلوم کہ عورت رحم اور محبت کے جذبات سے سرشار ہونے کے باعث اور شرم و حیا کی وجہ سے دبی دبی معلوم ہوتی ہے ورنہ اس کا عزم مرد سے ہزار درجہ بلند ہوتا ہے۔ اور اسکی تدبیر تقدیر پر فتح پاتی ہے۔

اندرما نے فرحت کے جواب میں کہا۔ "میں نہیں جانے کا فیصلہ کر چکی ہوں"۔

محسن اور فرحت اسکے فیصلہ کن فقرے سے حیران سے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اندرما کی عزیمت کے وہ قائل ہو گئے تھے۔

اسکی ہمتِ مردانہ کے پیشِ نظر مجالِ گفتگو نہ تھی۔

لدّاخ کے پہاڑی لوگ باوجود اس کے کہ یہیں پلے اور بڑھے تھے تاہم اس سیدھے پہاڑ کی چوٹی پر جانے کا حوصلہ نہ رکھتے تھے انتہا کی سردی اور عجیب وغریب روایات انہیں اس طرف رجوع نہ ہونے دیتی تھیں صبح اُٹھ کر مزدوروں کی تلاش شروع کی۔ سب مزدور کان پر ہاتھ دھرتے تھے۔ فرحت نے خیال کیا کہ ان خوفناک بلندیوں پر کسی لالچ کی بنا پر چڑھا جا سکتا ہے۔ وہ لداخ کے قریب کے دیہات میں گیا۔ جن غریب گھروں نے کبھی پیسہ نہ دیکھا تھا ان کے سامنے اس نے نوٹوں کے بنڈل رکھ دیئے۔ مفلسی سے مارے لوگ زندگی سے یُوں ہی بیزار ہوتے ہیں۔ اگر ایسے لوگوں کے بال بچّوں کی کفالت ہو جائے تو وہ خوشی سے موت کے منہ میں جانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ نوٹوں کو دیکھ کر بہت سے غریبوں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ خود زندگی مفلسی کی مصیبتوں میں گذاری، تو اپنی اولاد کے لئے آرام سے زندگی بسر کرنے کا موقعہ ہاتھ سے کیوں ضائع کریں۔ بنابریں کچھ دیہاتی لوگ اسباب اٹھا کر ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ فرحت نے ان کی خدمات کا گراں قدر معاوضہ دیکر ان کو ساتھ لے لیا۔ ان مزدوروں کے گھروں میں کہرام مچ گیا۔

اُنہیں معلوم تھا کہ اِن بلندیوں کا عزم کر کے آج تک کوئی واپس نہیں لَوٹا۔ فرحت خود متاثر تھا اور دل میں کہتا تھا کہ غریب کی زندگی کیسی حقیر ہے جو روپیہ کے بدلے قربان کی جا رہی ہے۔ لیکن یہ عزم مفید ہے۔ مفید مقصد کی تکمیل کے لئے ایسی قربانی جائز ہو سکتی ہے۔

رات کے وقت وہ آگ تاپ رہے تھے محسن کچھ مغموم سا دکھائی دیتا تھا۔ فرحت اس کو اس حال میں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اسے یہ خدشہ محسوس ہؤا کہ شاید محسن کی ہمّت جواب دے رہی ہے۔ سرکاری عمارت کے کمروں میں وہ الگ الگ سو گئے۔ مزدور اسی کمرے میں ایک جگہ لیٹ گئے۔ چڑھائی کا سامان مکمل ہو چکا تھا۔ صبح اللہ کا نام لے کر چلنا تھا۔ محسن کچھ نیم خواب کی حالت میں پڑا تھا۔ لمپ کی مدہم سی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ شہزادی نیلوفر اس کے سامنے کھڑی ہے۔ زلفیں حسین چہرے پر پریشان ہو کر سو سنگار پیدا کر رہی ہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ سارا کمرہ خوشی اور مسرت سے بھر گیا ہے۔ وہ آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگا کہ نہیں یہ خوشگوار خواب تو نہیں۔ نہیں اُس نے دل میں کہا یہ خواب تو نہیں۔ یہ تو میری آرزو حقیقت بن کر آگئی ہے۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور کہا شہزادی اس تکلیف فرمائی کی وجہ؟

شہزادی نیلوفر نے نرم اور لوچدار آواز میں کہا۔ میں آئی ہوں اس لئے کہ آپ کی ہمت بڑھاؤں۔ مجھے افسوس سے معلوم ہوا کہ آپ کا عزم جواب دے رہا ہے۔

محسن۔ میرا عزم شہزادی! اور جواب دے رہا ہو۔ جس کام کا تمہارے سامنے عہد کیا تھا اس کے سرانجام دینے میں ایک لمحہ کا تردد نہیں۔

شہزادی۔ تو میرا آنا رائیگاں تھا، لو میں جاتی ہوں۔

محسن مبہوت سا ہو کر بیٹھا رہا۔ شہزادی دروازہ کھول کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ یوں ہی حیران سا رہا۔ پھر سوچنے لگا کہ یہ وہم نہ تھا۔ نہ یہ خواب تھا۔ آخر شہزادی آئی اور چلی کہاں گئی۔ وہ اٹھا اور چاہا کہ چل کر فرحت کو جگاؤں۔ پھر اس نے کہا پہلے باہر جا کر شہزادی کو دیکھ تو آؤں۔ وہ اٹھا اور دور تک اِدھر اُدھر گیا۔ سارے کمرے دیکھنے لگا شہزادی کا کہیں نشان نہ ملا۔ حیران ہو کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ دل میں کہا کیا فرحت کو جگاؤں اور ماجرا بتاؤں۔ وہ مجھے بیوقوف بنائے گا۔ اندرا کو خبر ہو گی، تو وہ مجھے اُلّو سمجھے گی لیکن رات کی یہ کیفیت تو روزِ روشن کی طرح سچ ہے۔ میں جاگتا تھا کہ شہزادی آئی اور جاگتا تھا کہ میرے سامنے چلی گئی۔ وہ اتنی دور سے کیسے آئی اور اس دور و دراز مقام پر کیسے پہنچی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ

کہ اتنی جلدی کہاں غائب ہو گئی۔ مَیں کسی کو ہزار کہوں کہ شہزادی کا آنا حقیقت تھی ہر کوئی وہم سمجھے گا یا دل میں کہے گا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ جس بات کو زبان سے نکال کر خفت ہو اُسے بیان کرنے کی زحمت کیوں اُٹھائی جائے۔ مجھے اس واقعہ کو راز کی طرح دل میں رکھنا چاہیئے۔ اگر زبان پر لاؤں تو ہذیان کا مارا سمجھا جاؤنگا۔

محسن نے یہ فیصلہ کر کے سو جانے کی ناکام کوشش کی۔ اب وہ خود تذبذب میں پڑ گیا کہ جو دیکھا خواب تھا یا حقیقت۔ نہ اسے خواب کہے بن آتی تھی نہ حقیقت کا تصوّر کیئے اطمینان ہوتا تھا۔ انہی الجھنوں میں اُس نے آنکھوں میں رات کاٹ کر سحر کر دی۔ فرحت اور اندر ما دونوں نے محسن کو پریشان پاکر صبح حال پوچھا تو عرضِ حال کرتے کرتے رک جاتا تھا۔ اندر ما اس کیفیت سے متعجب تھی محسن کے اس حال کو دیکھ کر سفر اگلے دن پر ملتوی کر دیا گیا۔

رات کا جاگا ہوا محسن دوپہر کو سو گیا اور عصر کے وقت اُٹھا۔ اندر ما نے فرحت سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محسن رات بھر نہیں سویا۔ فرحت نے کہا ایسا ہی ہو گا۔ اندر ما نے کہا کہ محسن کو ضرور کوئی پریشانی ہے۔ فرحت نے جواب دیا کہ جب کٹھن منزل شروع ہو جائیگی تو پریشانیاں حقیقی خطرات میں بدل جائینگی اسلئے محسن کی پریشانی

سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ خطرات کا مقابلہ کرنے کی تدبیر کرنا چاہئے۔ اندرما اس جواب سے خاموش ہوگئی۔

دوسرے دن یہ چھوٹی سی مہم نامعلوم ہستیوں کی تلاش میں ان بلندیوں پر جانے کے لئے نکلی جو اب تک انسانی دسترس سے باہر سمجھی جاتی تھیں۔ چار گھنٹے کے سفر کے بعد مزدور سر پر اسباب اُٹھائے آگے ہوگئے اور خالی ہاتھ لٹکا کر چلنے والے محسن فرحت اور اندرما تھک کر پیچھے رہ گئے۔ پھر بیٹھ کر ذرا سستائے اور آگے کو چل دیئے۔ شام کے وقت ۱۵ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے۔ سردی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا میں تیزی آرہی تھی۔ انہوں نے چھوٹے خیمے گاڑ کر آگ روشن کرلی۔ اور اندرما فرحت اور محسن آگ کے گرد بیٹھ گئے۔ دوسرے خیمے میں مزدور بلا آگ جلائے بے خبر سو گئے۔ ان کے لئے ابھی وہ پہاڑ کا حصہ نہ آیا تھا جہاں کی سردی کو وہ ناقابل برداشت کہہ سکیں۔ ہر سہ میدانی علاقہ کے رہنے والے باوجود آگ تاپنے کے سردی محسوس کرتے تھے۔ کیونکہ سرد ہوا پیٹھ کو چھو رہی تھی۔ پہلی منزل پر اتنی سردی سے وہ اُوپر کی ہواؤں کا قیاس کرکے ہی کانپ رہے تھے۔ مزدوروں نے بتایا کہ صبح اور بھی مشکل منزل درپیش ہے۔ یہاں تک آنا جانا آسان تھا۔ اب وہ پہاڑ شروع ہونے والے ہیں

شام کے قریب جب اسباب اوپر جا چکا تو ان ہر سہ نے مزدوروں کے حسب ہدایت رسّوں کو اپنی کمروں سے مضبوط باندھ لیا۔ وہ بھی اسباب کی طرح اُوپر اُٹھائے گئے۔ انہیں اپنی ہیئت کذائی پر ہنسی بھی آتی لیکن یہ مقامِ خوف تھا۔ فوراً خوف کے خیال سے ہنسی بھُول جاتی۔ آخر یہ بھی گٹھڑیوں کی طرح اُوپر پہنچ گئے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں نے عجب سماں باندھ رکھا تھا۔ برفانی پہاڑ کے ہرن ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کچھ درخت برف میں کھڑے تھے ان ہی درختوں کے سبز پتّے ان کی خوراک تھی۔ آج رات مزدوروں نے بھی آگ تاپ کر کاٹی۔ اندرا فرخت اور محسن کی کچھ نہ پُوچھو۔ آگ بھی جلائی ہوئی تھی۔ گرم کپڑوں کے علاوہ اوپر کمبل بھی اوڑھے بیٹھے تھے۔ تیز و تند ہوائیں برف میں استادہ خیموں میں داخل ہو کر مصیبت کا باعث ہو رہی تھیں۔ ان تینوں میں محسن کی حالت زیادہ قابلِ رحم تھی۔ اس کو سردی سے زیادہ تکلیف تھی۔ باوجود اسکے کہ وہ بڑی ہمت سے کام لے رہا تھا اور قوی ارادہ اس کی تکلیف کو کم کر رہا تھا۔ لیکن سردی اس کی برداشت سے زیادہ ہو رہی تھی۔

محسن نے ہنس کر کہا۔ اندرا اگر دنیا کے بے وقوفوں کی تاریخ لکھی جائے گی تو ہماری اس حماقت کو نمایاں جگہ ملے گی۔ جو پراسرار

جو بالکل سیدھے کھڑے ہیں۔ جوں توں کر کے رات کاٹی۔ صبح سویرے ناشتہ کر کے پھر سفر پر چل دیئے۔ تین گھنٹے کے سفر کے بعد وہ مقام آ گیا جہاں سے آگے جانا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ پہاڑی مزدوروں نے اسباب کو رکھ دیا۔ موٹے موٹے رسے نکال کر ان کے گٹھڑ باندھ کر کھڑے ہو ہو کر نہایت حزم واحتیاط سے آہستہ آہستہ برف پوش پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ ذرا سی بے احتیاطی ان کو موت کے منہ میں گرانے کے لئے کافی تھی۔ محسن فرحت اور اندرما دم بخود ہو کر خوفناک چڑھائی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کو ہر لمحہ یہ خیال تھا کہ اب گرے اب گرے وہ دوپہر تک چوٹی پر صحیح سلامت پہنچ گئے۔

ہر طرف دائمی برف سے ڈھکے سفید پوش پہاڑ دھوپ میں جگمگ جگمگ کرتے تھے۔ سورج کی کرنوں نے وہاں بہار پیدا کی ہوئی تھی۔ کہیں نگاہ نہ ٹھہرتی تھی لیکن سردی اس بلا کی تھی کہ گرم کپڑوں کے باوجود دوپہر کے وقت بھی جسم کانپ رہا تھا۔ پہاڑ کی اوٹ میں جہاں کرنیں نہ پڑتی تھیں وہ اوپر پہنچے اور پہنچ کر وہ موٹے رسے جن سے گٹھڑ وہ اوپر لے گئے تھے انہوں نے نیچے لٹکا دیئے۔

اندرما فرحت اور محسن نے اسباب کو ان رسوں سے باندھنا شروع کیا۔ اور مزدور رسوں کو کھینچ کر اسباب چوٹی تک پہنچاتے رہے۔

ہستی کی تلاش میں اپنی ہستی گم کرنے کو نکلے ہیں۔ جب یہاں سردی کی یہ کیفیت ہے تو ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اس سے بلند تر مقام پر کسی ذی حیات کا رہنا ہی ممکن نہیں۔

اندرما بولی۔ جانِ برادر چاہے ہم مانیں نہ مانیں لیکن ہندوؤں کا ایک گروہ اور اینی بسنت کے پیرو پر اسرار شخصیتوں کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ سات آقا مل کر دنیا کی ترقی کے ذمہ دار ہیں۔ اور وہ کل کائنات کے نظام کو چلانے میں مدد دے رہے ہیں۔ یا کم از کم ہمدردانہ مداخلت کرتے ہیں اور وہ اکثر لوگوں پر ظاہر ہو کر ان کی راہنمائی کرتے ہیں۔ زمان و مکان کی اس کے لئے کوئی پابندی نہیں۔ وہ چشم زدن میں ملک ملک کی سیر کر آتے ہیں۔ لیکن ہمالیہ کی بلندیاں ہی خاص طور پر اُن کی جائے استقامت کہی جاتی ہے۔

فرحت۔ گو ہم بظاہر اپنے ہی وہم کی تلاش میں مصروف معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے اشخاص کے وجود کا مذہب منکر نہیں۔ قرآن پاک میں حضرت موسیٰ اور ایک پُراسرار شخصیت کی ملاقات کا قصہ کیسا محیّر العقول ہے۔

محسن فرحت کے اس اشارے سے خاموش ہو گیا لیکن اندرما نے اس قصہ کی تفصیل سننے پر اصرار کیا۔

فرحت بولا کہ قرآنِ حکیم کے مفسروں کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ کے معجزات نے جب عقلِ انسانی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ تو آپ کی قوم نے سوال کیا کہ آپ سے زیادہ کوئی اس عالم میں علم رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں۔ وحی ہوئی کہ دریا کے سنگم کے قریب تمہیں ہمارا ایک بندہ ملے گا جو علم و فضل میں تم سے زیادہ ہوگا۔ ایک مچھلی تل کر ساتھ لے جاؤ۔ جہاں یہ مچھلی گم ہو جائے وہیں میرے اس بندے کا انتظار کرو۔ حضرت موسیٰ اپنے ایک خادم کے ساتھ مچھلی تل کر اس عالم کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے دو دریا جہاں ملتے تھے وہیں ٹھہرے۔ کوفت سفر سے چُور چُور ہو کر سو گئے۔ خادم ابھی بیدار تھا اُس نے تعجب سے دیکھا کہ مچھلی زندہ ہو کر پانی میں چل دی۔ خادم نے دل میں کہا جب حضرت اُٹھینگے تو ماجرا بیان کروں گا۔ جب حضرت موسیٰ دیر کے بعد سو کر اُٹھے تو خادم مچھلی کی حیرت انگیز حکایت کہنا بھول گیا اور دونوں اُٹھ کر آگے کو چلے گئے۔ جب تھوڑی دُور گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خادم سے فرمایا کہ مچھلی ہے۔ مچھلی کا ذکر آتے ہی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔ اور اس نے وہ تعجب انگیز واقعہ حضرت موسیٰ کو سنایا۔ آپ نے کہا کہ اسی جگہ لوٹ چلو۔ اس جگہ آپ کو ایک

شخص ملا۔ حضرت موسٰے نے اس شخص کو کہا کہ کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہُوں تاکہ میں آپ کے علم سے استفادہ حاصل کروں۔ اس شخص نے حضرت موسٰے سے کہا آپ میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکیں گے۔ انسان اس بات پر صبر نہیں کر سکتا جو اس کے احاطہ علم سے باہر ہو۔ حضرت موسٰی علیہ السلام نے بزرگ موصوف کو یقین دلایا کہ آپ مجھے ہر حال میں صابر پائیں گے۔ اور مَیں آپ کی کسی بات پر اعتراض نہ کرونگا۔ اس نے کہا اچھا یاد رکھنا۔ جب تک مَیں خود کوئی بات نہ بتاؤں کوئی سوال نہ کرنا۔

الغرض اس عہد و پیمان کے بعد دونوں دریا کے اس پار جانے کے لئے ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ جب کنارے جا لگے تو اس شخص نے موقعہ مناسب پا کر کچھ تختے توڑ کر کشتی کو بیکار کر دیا۔ حضرت موسٰی کو اس شرارت پر جلال آگیا اور اس بزرگ کو ملامت کی کہ تو نے ناحق غریبوں کی کشتی کو خراب کر کے ان کی روزی چھین لی۔

اس بزرگ نے متانت سے کہا موسٰے اپنے وعدے کو یاد کرو۔ مَیں نے کہا تھا کہ تم صبر نہ کر سکو گے۔ حضرت موسٰی علیہ السلام معذرت کرنے لگے اور کہا کہ آئندہ ایسی مداخلت نہ ہوگی۔ جو ہو چکا

سوہو چکا اب مجھے زیادہ شرمندہ نہ کریں۔ ایک موقعہ اور دیں۔

پھر دونوں آگے چلے۔ اس بزرگ نے ایک اکیلے لڑکے کو جاتے پکڑ لیا اور اس کو قتل کر دیا۔ قتل عمد کی اس واردات سے حضرت موسٰے آپے سے باہر ہو گئے اور کہا اے شخص تو نے بڑا ظلم کیا کہ ایک بے گناہ بچّے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس بزرگ نے پھر کہا کہ میں نے نہ کہا تھا کہ تم سے صبر نہ ہو سکے گا۔

حضرت موسٰی کو پھر شرمندگی اُٹھانا پڑی اور معذرت کر کے کہا کہ اگر آئندہ ایسی غلطی مجھ سے ہُوئی تو بے شک آپ مجھے علیحدہ کر دیں مجھے عذر نہ ہو گا۔

چنانچہ وہ آگے کو چلے اور ایک گاؤں میں پہنچے۔ جہاں کے لوگوں نے ان کی مہمان نوازی سے انکار کر دیا۔ اس بدسلوکی کو دیکھ کر وہ لوٹنا چاہتے تھے کہ اس بزرگ نے ایک مکان کی پرانی دیوار کو درست کرنا شروع کر دیا۔ اور حضرت موسٰی کو بھی بلا مزد محنت میں شامل ہونا پڑا۔

حضرت موسٰی نے لوگوں کی بدسلوکی اور اس بزرگ کے احسان پر تعجب کیا اور کہا کہ اگر محنت کی مزدوری مل جاتی تو بھوک کا سامان

ہو جاتا۔

اس بزرگ نے کہا کہ لو اب حجّت تمام ہوئی تم سے صبر نہ ہو سکا۔ اب میری اور تمہاری علیحدگی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں لیکن اِن چیزوں کی حقیقت میں بتائے دیتا ہوں

اس کشتی کے مالک ازبس غریب تھے۔ حاکمِ وقت زبردستی کشتیاں پکڑتا آرہا تھا قبل اس کے کہ وہ ان غریبوں کی کشتی کو ہتھیائے مَیں نے مناسب سمجھا کہ اس کشتی کو بے کار کر کے رکھ دوں تاکہ اُسے ناکارہ سمجھ کر چھوڑ جائے۔ وہ لڑکا جو میرے ہاتھ سے قتل ہُوا بد صحبت میں پڑ کر بُری عادتیں اخذ کر چکا تھا۔ ڈر تھا کہ جوان ہو تو نیک والدین کو سرکشی سے تنگ کرے اور نیک راستے سے ہٹائے۔ اس کی موت کے بعد خدا اس کے والدین کے گھر نیک اولاد دیگا جو عبادت اور حسنِ سلوک میں بہتر ہوگی۔ تیسرے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے اس بزرگ نے کہا کہ گرنے والی دیوار کے مالک دو یتیم بچّے تھے۔ ان بچّوں کا باپ نیک انسان تھا۔ اس کا دفینہ اسی دیوار کے نیچے مدفون تھا۔ میں نے مناسب خیال کیا کہ دیوار کو گرنے سے بچا کر اس کے مال کی محافظت کر دی جائے۔ تاکہ بچّے جب بڑے ہوں تو دفینہ نکال لیں۔

اس بزرگ نے کہا کوئی کام میں نے اپنی رائے اور ارادے
سے نہیں کیا۔ بلکہ دم بدم اللہ کا منشا پاکر ایسا کیا ہے۔
محسن نے کہا۔ فرحت پیغمبروں سے بلند تر شخصیت کے
وجود کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔
فرحت۔ بلند تر کیوں کہتے ہو۔ صرف اس لئے حضرت موسیٰ جیسا
اولوالعزم پیغمبر اس بزرگ کے افعال کی کنہ کو نہ پہنچ سکا۔ لیکن گمراہ
قوم کو راہِ راست پر لانا اور غلام ملک کو آزاد کرانا ایسی مشقت ہے
جس سے جسم اور جان دونوں تھک کر چُور چُور ہو جاتے ہیں۔ کیا تم
یہ سمجھتے ہو کہ اگر حضرت موسیٰ کی ڈیوٹی یعنی قوم کی اخلاقی معاشرتی
اور سیاسی اصلاح اس بزرگ کے سپرد کر دی جاتی تو وہ بزرگ
حضرت موسیٰ کی طرح کامیاب ہوتے؟ پیغمبروں کے سپرد قوم کی
سیاسی سربلندی کے ساتھ پاکیزگی اخلاق کا کام کیا جاتا ہے۔
جس کو فرشتے بھی شاید کماحقہٗ ادا نہ کر سکیں۔

اندرما نے کہا تم دونوں ان واقعات پر ایمان رکھتے ہو تو پھر وجہ
شبہ نہیں کہ محیر العقول ہستیوں کا وجود ہے جن سے خلافِ عادت
افعال سرزد ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ کائنات میں اپنے علم کی بنا
پر عام قانونِ اخلاق سے بے نیاز ہیں۔

محسن - مگر انہی نامعلوم بزرگ کو اس وقت تک زندہ کیسے مان لیا جائے۔
فرحت عقل انکار کرے مگر بعض کتب اور روایتوں میں حضرت خضر کی عمر اور محیر العقول افعال کا ذکر ہے۔ ان روایتوں کو بعض بعید ضعیف سمجھ کر انکار کرتے ہیں۔ اور بعض اس کو قبول کرتے ہیں۔
مُحسن - اسلامی روایات اِن خرقِ عادت اعمال کے حاملین کا مسکن ملک شام بتاتی ہیں اور ہم ان پہاڑوں میں ٹکریں مار رہے ہیں۔
فرحت - اول تو ہم آپ کے بیان کردہ نوشتے کے مطابق یہاں آئے ہیں لیکن اگر ہم کسی ایسی ہستی کا وجُود جس سے ہمیں بروئے قرآن انکار نہیں مان لیں۔ اور جس کے سامنے حضرت موسیٰ جیسا اولوالعزم پیغمبر بھی طفلِ مکتب ہے تو پھر یہ الجھن نہیں رہ جاتی کہ انہیں شام سے ہندوستان تک سفر کرنے میں بڑی دقت اور دشواری ہے جو ہمیں تمہیں ہے۔ یہ بات تو بعض مسلمانوں کے نزدیک بھی مسلم ہے کہ کچھ لوگوں کو دقتِ سفر نہیں ہوتی۔ وہ خُدا کا حکم پا کر پل بھر میں ہزاروں میل سفر کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے مقام پر لامکان ہو جاتے ہیں اور گھر بیٹھے دنیا کا تماشا دیکھتے ہیں۔
محسن - اچھا۔ بس سو جانے کی کوشش کرنا چاہئے۔

اُنہوں نے آگ کو اور روشن کیا اس میں زیادہ سے زیادہ لکڑیاں ڈال کر لیٹ رہے۔ صبح کو اُٹھ کر پھر پہاڑ کی چڑھائی شروع کی۔ اب ہوائیں تلوار کی طرح تیز ہو رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں اینٹھنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ برف زور شور سے پڑنا شروع ہو گئی۔ ان کی مصیبتیں انتہا کو پہنچ گئیں۔ ایک قدم اُٹھانا میلوں کے سفر کے برابر تھا۔ دھند اور کُہر سی کائنات پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں شام اور دوپہر ایک تھی۔ زندگی میں ایسی کٹھن منزل کسی نے کیا دیکھی ہوگی۔ مایوسی ہر طرف سے گھیرے کھڑی تھی۔ موت سامنے آکر گھورتی تھی۔

محسن نے کہا۔ اب آگے جانا فضول ہے

فرحت نے اپنی طبیعت کے خلاف اصرار کیا اور کہا کہ واپسی سے موت بہتر ہے۔ یا تو یہ ارادہ نہ کیا ہوتا اب یہاں تک پہنچ کر واپس لوٹ جانا اپنی نسل میں بزدلی ورثہ میں چھوڑنے کے برابر ہے۔ آپ نے ہمیں اس راستہ پر ڈالا نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

اندرما نے فرحت کی تائید کی کہ موت سے ڈر کر منزل مقصود پر نہ پہنچنا شریفوں کا شیوہ نہیں خواہ وہ نوشتہ جو ہمیں یہاں لانے کا محرک ہُوا بالآخر ناشائستہ مذاق ہی کیوں ثابت نہ ہو

لیکن نامعلوم مقامات پر پہلے پہنچنا بھی قوم کی شان ہے۔ اگر اپنے ملک اور نسل کی شان بڑھاتے ہوئے ہم مرجائیں تو یہ موت اس زندگی سے بہتر ہے جو تن آسانی میں بسر ہو جائے۔

محسن اس عورت کے خیالات سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ سب زور لگا کر چڑھنے لگے۔ تند ہوا اور سخت سردی پہاڑ کی طرح ان کی ترقی میں حائل تھی۔ ان کا خون گویا لحظہ بلحظہ جم رہا تھا۔ مزدوروں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ وہاں آگ جلانا ناممکن تھا خیمہ نصب کرنا قطعی محال تھا۔ جان کے خوف سے تمام مزدور اسباب چھوڑ کر نیچے اتر گئے کیونکہ وہاں ٹھہرنا انسانی جان کے لئے خالی از خطرہ نہ تھا۔ اب موت اور منزل دونوں قریب تھے۔ انہیں یقین نہ تھا کہ دونوں میں کس کو جلدی حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی جگہ ٹھہرنا اور آگے نہ بڑھنا بھی موت ہی تھا۔ اس لئے فرحت نے اللہ کا نام لے کر اوپر چڑھنا شروع کیا۔ اندرما بھی زور لگا کر پیچھے پیچھے ہولی۔ اندرما کو دیکھ کر محسن کو غیرت آئی وہ بھی روانہ ہوا۔ منزل باوجود قریب ہونے کے دور دکھائی دیتی تھی۔ پہاڑ اور برف پر چڑھنے سے اُن کے پاؤں پتھر کے ہو گئے تھے۔ وہ اُوپر جانے کی کوشش کرتے تھے انہیں کوئی نیچے کھینچتا معلوم ہوتا تھا۔ ہوا کی تیزی

طوفان میں تبدیل ہو گئی تھی۔ سردی تلوار اور سنان سے زیادہ زخم لگا رہی تھی۔ دُھند اور کہر کے باعث ہاتھ پسارا دکھائی نہ دیتا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ فرحت سب سے آگے تھا اندر ما اس کے پیچھے اور محسن سب سے پیچھے احتیاط سے قدم اُٹھاتا چلا آرہا تھا۔ راستہ کہیں نظر نہ آتا تھا۔ ذرا سی لغزش ایک غلط قدم میلوں گہری غار میں گرا دیتا۔ بلاخیز طُوفان، برفباری انتہا کی سردی اور ہمت شکن کوفت نے ان کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ ان کی عقل پریشان اور آنکھیں اندھی سی ہو رہی تھیں منزل نظر سے اوجھل تھی۔ موت کا ٹھنڈا سانس برف باری میں محسوس ہو رہا تھا۔

فرحت نے کہا موت نے ہمیں گھیر لیا لیکن آخری سانس تک سعی جاری رکھنا چاہئے۔ پیچھے ہٹیں تو بھی ٹھکانا نہیں۔ آگے جائیں تو بھی راہ نہیں۔ لیکن قدم پیچھے ہٹا کر مرنے سے آگے بڑھ کر مرنا بہتر ہے۔ انہوں نے نامعلوم راستے پر اندھا دھند چڑھنا شروع کیا یہ ان کی آخری کوشش تھی۔ انہوں نے اس دفعہ اتنا زور لگایا کہ زور باقی نہ رہ گیا۔ وہ تینوں آخری سعی میں چوٹی پر پہنچ گئے۔ اس حال میں پہنچنے سے کیا فائدہ۔ دماغ سردی سے بیکار اور جسم ٹھٹھر

چکا تھا۔ وہ تینوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر برف کے وسیع تودے پر گر پڑے۔ کہر اور دھند نے ان پر میلا سا کپڑا ڈال دیا۔ جھکڑ چل رہا تھا۔ وہ دُھند اور کُہر کا اوڑھنا بچھونا کرکے برف کی لحد میں پڑ گئے ہے۔ ایک آدھ منٹ میں زندگی کی آخری رمق بھی باقی نہ رہے گی۔

اندرما بے بسی سے فرحت کی آغوش میں پڑی تھی۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ فرحت نے آخری وقت اندرما کو پیار سے سینے سے لگا لیا تھا۔ لیکن نہیں وہ بے ہوش ہو کر گرے تھے انہیں سر پاؤں کی ہوش نہ رہی تھی۔ موت کے وقت انہیں یُوں پڑتے کا خیال کب نہ تھا۔ بے ہوش ہو کر گرتے وقت ان کے ذہن میں یہ تصوّر نہ تھا کہ ہم آغوش ہو کر مریں۔

اچانک تینوں نے محسوس کیا کہ وہ کسی خوشگوار مقام پر آ گئے ہیں جہاں موسم کا اعتدال دل و دماغ کی قوتوں کو بیدار کر رہا ہے۔ موسم کے تعجب انگیز اعتدال کے ساتھ یکبیک پھر ہوا کا زور خوفناک طوفان بن گیا۔ وہ سردی سے محفوظ تھے مگر روئی کے گالے کی طرح ہوا کے رُخ پر جا رہے تھے۔ وہ ٹھہرنے کی کوشش کرتے تھے مگر پاؤں کہیں نہ جمتے۔ وہ یوں ہی جمتے اکھڑتے ایک خوفناک غار کے منہ

پر پہنچ گئے ۔ جہاں ایک ہیبت ناک کتّا جست لگا کر ان پر حملہ آور ہونے کے لئے تیار بیٹھا تھا ۔ کتّے کی آنکھیں مشعل کی طرح روشن تھیں ۔ اس کا منہ غار کی طرح خوفناک طور پر کھلا تھا ۔ وہ اس کو دیکھ کر کانپ اُٹھے لیکن ہوا کی تیزی سے مجبور ہو کر کُتّے کے بہت ہی قریب پہنچ گئے وہ ڈر کر لوٹنا چاہتے تھے لیکن ہوا اور قریب کر رہی تھی ۔ جب وہ اس کے منہ کے قریب پہنچ گئے ۔ تو کتا دُم ہلانے لگا ۔ گویا وہ انہیں خوش آمدید کہہ رہا ہے ۔ غار کے اندر جھانکنے سے وحشت ہوتی تھی ۔ ہوا کے مقابلہ کے لئے انہوں نے بے حد جد و جہد کی ۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ ان کی سعی دریا کے بہاؤ میں بے بس تنکے کی سی ہے ۔ ہوا انہیں اس مقامِ خوف میں دھکیل کر لے گئی ۔ ان کی آنکھوں کے سامنے تہ بہ تہ اندھیرا تھا ۔ پتھروں سے ٹکرانے یا کسی اور گہری غار میں گر جانے کا خوف مار رہا تھا ۔ بتدریج ہوا کا زور کم ہونا شروع ہؤا لیکن اب گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہاتھ پسارا سوجھائی نہ دیتا تھا ۔ جائیں تو کدھر جائیں انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ دائیں بائیں آگے پیچھے سفر کرتے رہے ۔ ہر طرف تھوڑی دُور جا کر انہیں معلوم ہؤا کہ پہاڑوں کی دیواریں سدّ راہ بنی کھڑی ہیں ۔ وہ دیر تک مارے مارے پھرتے رہے ۔ اس طرح ٹکریں

مار کر جب تھک گئے تو فرش پر بیٹھ گئے۔ ایسی خواب آور ہوا چلنا شروع ہوئی کہ باوجود کوشش کے وہ نیند پر غلبہ نہ پا سکے اور بے خبر سو گئے۔

ملاقات

تھوڑی دیر کے بعد انہیں گمان گزرا کہ وہ ایک نرم اور مکلف بستر پر پڑے نیند کے مزے لیکر اُٹھے ہیں۔ اردگرد نگاہ کی تو صبح خنداں تھی۔ برف کا فرش ہر طرف بچھا تھا۔ یہ فرش نرم اور گداز ہونے کے باعث بہت ٹھنڈا نہ تھا۔ کُہر اور دُھند جو ہر طرف محیط تھی اس کا نام ونشان نہ تھا۔ وہ اللہ کا نام لیتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سفید ریش بزرگ جس کے چہرے پر نور تھا اور آنکھوں سے شرافت برستی تھی ان کو دیکھ کر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ سر سے ننگا تھا اس کے سر کے بال گھنگھریالے تھے۔ وہ سفید کفنی پہنے کھڑا کائنات پر نور برسا رہا تھا۔

اُس نے بزرگانہ شفقت سے کہا تم اچھے ہو محسن اور اندریا خدا تم پر برکتوں کی بارش کرے۔ کچھ دیر قیام کرو۔ تمہاری ہمّت نے تمہیں جس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ اس میں اب آسودہ رہو۔

فرحت کی طرف مخاطب ہو کر وہ بزرگ بولا۔ تم اُٹھو بیٹی نیلوفر عزیز شہزادی تمہارا پیارا باپ دمِ واپسیں پر ہے۔ تمہاری ملاقات اس کی آخری خواہش ہے۔ آؤ چلیں اور اس کی اس آرزو کو پورا

کریں۔

شہزادی نیلوفر جو فرحت کے لباس میں تھی تڑپ کر اُٹھی۔ اندرما اور محسن کا منہ حیرانی سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس بزرگ نے نیلوفر کا ہاتھ تھاما اور دونوں بیٹھے موٹر کر چل دیئے اور تھوڑی دُور جا کر نگاہ سے غائب ہو گئے۔

اندرما اور محسن دیر تک خاموش رہے۔ اندرما کی آرزوؤں کا مرکز اس کی ایک ہم جنس نکلی اور محسن کا ملازم حسن کی وہ شہزادی تھی جس کی تمناؤں میں وہ جان جوکھوں میں ڈالنے آیا تھا محسن اندرما اور اندرما محسن کو دیکھ کر زمانہ کی نیرنگی پر خاموش تبصرہ کر رہے تھے۔ اب محسن کو خیال گذرا کہ لدّاخ میں رات کو جو واقعہ پیش آیا وہ خواب نہ تھا بلکہ فرحت نے اپنے اصلی لباس میں آکر مجھے ملامت کرنا مناسب سمجھا۔ مبادا میں حوصلہ ہار کر ہاتھ پاؤں توڑ بیٹھوں اور منزلِ مقصود تک پہنچنے سے گریز کروں۔ اندرما کو اب محسوس ہوا کہ فرحت خدمت کی فراوانی کے باوجود کیوں محبت کرنے سے جی چراتا تھا اور باوجود میری گرمجوشیوں کے وہ کیوں سرد مہر تھا۔

فرحت یعنی شہزادی نیلوفر نے چند قدم چل کر محسوس کیا کہ وہ قدم نہیں اُٹھا رہی ہے بلکہ زمین ان کے پاؤں میں کھنچی چلی آرہی ہے۔

وہ پل بھر میں بغداد پہنچ گئے۔ وہ باپ کے وسیع ایوان کی ڈیوڑھی میں سے گذر کر باپ کی خواب گاہ کی طرف دوڑی گئی۔ اور جاتے ہی بیمار باپ کو لپٹ گئی۔ باپ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بیٹی کو چھاتی سے لگایا۔ آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری ہو گئے۔ شہزادی نے مژدہ سنایا کہ باپ ہم نے اس نوشتہ کے مطابق مقام پالیا۔ اِن سوالات کا صحیح جواب ملنے کا حق الیقین ہو گیا ہے۔ سلطان مغفور نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر پروردگار کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی جس نے یہ دن دکھایا۔ اُٹھے ہُوئے ہاتھ نقاہت سے جلد ہی گر پڑے۔ سلطان اس اچانک خوشی کا متحمل نہ ہو سکا اور خوشی خوشی دنیا کو چھوڑ گیا۔

سلطان کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس بزرگ نے کہا۔ لو بیٹی تمہارے ساتھی تمہارے منتظر ہیں۔ ملازموں کو حکم دو کہ وہ جلدی نہلا کر تمہارے سامنے کفن ڈال دیں۔ زمانے میں مجھے بہت کم مہلت ہے۔ میرا یہاں زیادہ ٹھہرنا ممکن نہیں۔

شہزادی کے حکم کے مطابق سلطان کو آدھ گھنٹے کے اندر اندر کفن پہنا دیا گیا۔ بغداد کی گلی بازار میں کہرام مچ گیا۔ کہ مخیّر ترین انسان راہئ ملکِ بقا ہو گیا۔ یتیموں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

بیواؤں نے آہ و فغاں کی۔ غریب تڑپ اُٹھے۔ سلطان کے ایوان کے آگے انبوہِ کثیر جمع ہو گیا۔ جو فانی دنیا سے بیزاری کا اظہار کر رہا تھا

تمام رسوم سے فارغ ہو کر شہزادی بچشمِ پُرنم وہاں سے اٹھی مکان کے عقب سے دونوں نکل آئے۔ شہزادی نے محسوس کیا کہ وہ ہی سفر نہیں کر رہی بلکہ زمین اس کے پاؤں کے نیچے کھچی چلی آ رہی ہے۔ وہ دونوں پھر چشم زدن میں اسی جگہ پہنچ گئے جہاں اندرما اور محسن ان کا انتظار کر رہے تھے۔

اس بزرگ نے تینوں کو کہا لو آؤ بیٹا اندر چلیں۔ اس نے فرش پر پاؤں مارا اور ایک بڑا دروازہ کھل گیا۔ جب وہ چاروں دروازہ میں داخل ہوئے تو سامنے ایک خوبصورت باغ پر ابر محیط دیکھا اور اسی وسیع باغ کے وسط میں ایک مرمریں سیڑھیوں والا خوبصورت تالاب تھا جس کے کناروں پر کچھ اور بزرگ محوِ خواب تھے۔ یُوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ ابھی یادِ خدا سے فارغ ہو کر لیٹے ہیں۔ ان کے چہروں سے سرمدی جلال ٹپک رہا تھا اور ان کا لباس فرشتوں کے روایتی لباس سے زیادہ صاف ستھرا تھا۔

اس بزرگ نے کہا بتاؤ بچّو تمہاری میں کیا مدد کر سکتا ہُوں۔

شہزادی نیلوفر نے پہلے سوال کیا کہ آپ کون ہیں۔

بزرگ۔ مَیں خدا کا بندہ اور اس کی مخلوق ہُوں۔ لڑکی

شہزادی۔ کیا آپ وہی ہیں جو حضرت موسےٰ کو ملے تھے۔

وہ بزرگ خاموش ہوگیا۔ اور مسکرا کر شہزادی کی طرف دیکھنے لگا۔ گویا یہ سوال اس کی منشا کے خلاف تھا۔

شہزادی نے اس خیال سے کہ میرے فضول سوال بارِ خاطر نہ ہوں اور کہیں اس کے ناراض ہو کر جانے سے جس مقصد کیلئے یہاں آئے وہی فوت نہ ہو جائے۔ کہا کہ اس غرض کے لئے حاضر ہُوئے ہیں کہ

بزرگ نے بات کاٹ کر کہا۔ مجھے تمہارا مقصدِ سفر معلوم ہے بغیر تمہید کے سوالات دریافت کرتے جاؤ اور مَیں اپنے علم کے مطابق جواب دیتا جاؤں۔

شہزادی۔ خدا قول میں ہے یا فعل میں۔

بزرگ۔ فعل میں۔

شہزادی۔ دنیا کو کس طرح جیتا جا سکتا ہے۔

بزرگ۔ خدمت سے۔

شہزادی۔ مسلمان دنیا بھر میں اقتصادی طور پر بدحال کیوں ہیں؟

بزرگ۔ اسلام سرمایہ داری کا کھلا مخالف تھا۔ مسلمان کا واسطہ

ان قوموں سے پڑا جن کے رجحانات سرمایہ دارانہ تھے۔ جب تک سلطنت مسلمانوں میں رہی کچھ نہ کچھ تحفظ ہوتا گیا۔ جہاں جہاں سلطنت ہاتھ سے نکل گئی۔ وہاں غیر اسلامی سرمایہ داروں نے مسلمان کا اثاثہ ہتھیالیا۔ سرمایہ دارانہ ذہن رکھنے والی قوم سرمایہ داری سے خالی الذہن قوم کو چند دنوں میں فقیر کر دیتی ہے۔

شہزادی۔ اس کا حل کیا ہے۔

بزرگ۔ یا خود بھی سرمایہ دارانہ ذہن پیدا کرلو یا سرمایہ دارانہ ذہن کو ہمت کرکے دنیا سے مٹا دو۔

شہزادی۔ دنیا اور دین کے کاموں میں کامیابی کی اولیں شرط کیا ہے۔

بزرگ۔ ہمت اور کوشش۔

شہزادی۔ غلام ملک آزادی کیونکر حاصل کر سکتے ہیں۔

بزرگ۔ جان پر کھیل کر۔

شہزادی۔ آزادی کو کیونکر برقرار رکھ سکتے ہیں۔

بزرگ۔ جان پر کھیل کر۔

شہزادی۔ ہندوستان کی آزادی میں کیا رکاوٹ ہے۔

بزرگ۔ مختلف الخیال لوگ۔

شہزادی۔ ہندوستان کی آزادی کی آسان راہ کیا ہے؟

بزرگ۔ مختلف قوموں کا یکجان ہونا۔
شہزادی۔ ممالک اسلامیہ کی گلو خلاصی کب ہوگی۔
بزرگ۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد۔
تینوں نے دل میں کہا یہ تو کوئی نئی باتیں نہیں تھیں جن کے لئے ایسی صعوبت سفر اٹھائی جاتی۔
محسن اور شہزادی کے دل میں بیک وقت یہ خیال گذرا کہ کاش کوئی قرونِ اولیٰ یا قرونِ وسطیٰ کے دل گردہ کا مسلمان ہمیں میسّر آجاتا تو ہم اس کی رہنمائی میں ہندوستان کی مشکلات کا اور دنیائے اسلام کی مصیبتوں کا حل نکالتے۔ ان جوابات سے ہماری طبیعت ابھی تشنہ ہے۔ اگر اس خواہش کا اس بزرگ سے اظہار کریں تو خوف ہے کہ انکے مزاج کے لئے گراں ہو۔
بزرگ۔ تمہارے دلی خیالات مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ بچو! ان سوالات کا جواب مَیں تمہیں لداخ میں حل کر دے دینا چاہتا تھا۔ لیکن منشائے ایزدی یہ تھا کہ تمہارے عزم وارادہ کا امتحان لیا جائے۔ اور تمہارا اپنا عمل تمہارے پہلے سوال کا جواب ہو جائے۔ خدا کی منشا کے خلاف حرکت یہ ہماری مجال نہیں۔ میں منشائے ایزدی سمجھ کر رک گیا۔

شہزادی۔ کیا آپ فرشتے ہیں بابا۔

بزرگ۔ مجھے ابھی کچھ عرصہ اور آپ کی رفاقت منظور ہے۔ ایسے سوالات میری اور آپ کی جدائی کا باعث ہو جائیں گے میری حقیقت کے متعلق تمہیں کیا تشویش ہے۔ فرشتے ہوں یا پیغمبر، جن ہوں یا انس کسی کو بارگاہِ ایزدی میں یارائے دم زدن نہیں۔ تم واپس جا کر میری عظمت کے چرچے کرنا چاہتے ہو۔ جان لو کہ خدا کے سامنے ہم سب ہیچ ہیں۔ فانی اور باقی کا مقابلہ کیا ہے۔

تمہارے سوالات کا جواب آگیا۔ لو آؤ چلو، ابھی آخری جواب کی تشریح باقی ہے۔ محسن اور شہزادی تمہاری دلی خواہش بھی پوری ہو جائیگی۔ ہمیں ابھی ملتان پہنچنا ہے۔ وہ بزرگ آگے آگے ہولیا۔ شہزادی نیلوفر، اندرما اور محسن تینوں پیچھے پیچھے چلے۔ زمین بدستور ان کی طرف کھچی چلی آرہی تھی۔ بڑے بڑے شہر اور قصبے چھوٹے جا رہے تھے۔ اندرما نے یہ کیفیت دیکھی۔ دل میں کہا ہم ملتان کو جا رہے ہیں یا ملتان ہماری طرف آرہا ہے۔ اس بزرگ نے پلٹ کر اندرما کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ تینوں محسوس کر رہے تھے کہ اس بزرگ کی معیت میں ان

کے قلب نُور سے بھر رہے ہیں۔ وہ ایسی خوشی محسوس کرتے تھے گویا جنّت کی سیر کا حظ اُٹھا رہے ہیں۔

وہ پاک دروازے پہنچ گئے۔ بزرگ نے کہا تم شہر میں گھوم کر بعد نمازِ مغرب اسی جگہ مجھے آملو۔ وہ جلدی میں یہ بات کہہ کر ایک موڑ مڑ گیا۔ محسن شہزادی نیلوفر اور اندرما جب تنہا رہ گئے تو وہ سوچنے لگے کہ اب کدھر جائیں۔ یہاں نہ کوئی معقول ہوٹل نہ کوئی واقف۔ تاہم انہوں نے ایک معمولی سے ہوٹل میں شب باشی کا بھی انتظام کر لیا۔ اس کے بعد تانگہ کرایہ پر لے کر تھوڑی دیر تک سیر کریں گے۔ پھر رات کے پروگرام کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ تانگے والا انہیں مقابر پر لئے پھرا۔ کیونکہ گورستان ہی یہاں کا دلفریب نظارہ ہے۔ جہاں سادات کی قبریں امتیوں کی سجدہ گاہ ہیں۔

اندرما اور محسن نے دیکھا کہ شہزادی نیلوفر کی روشن آنکھیں آنسوؤں کے موتی پرو رہی ہیں۔ دریافت پر شہزادی نے باپ کی موت کی خبر سنائی۔ دونوں غمگین ہو گئے۔ رسمِ دنیا کے مطابق تسلّی دی کہ ایک دن سب نے اس جہان سے جانا ہے۔ کیا اچھی موت تھی کہ والدِ محترم نے بیٹی کو بھی مرتے دم دیکھ پایا اور مقصدِ زندگی حاصل ہونے کی بھی خوشخبری سن لی۔

جگہ جگہ پھرتے پھراتے شام ہوگئی اور وہ پاک دروازے کے قریب اس بزرگ کا انتظار کرنے لگے۔ اندرما نے کہا ہماری خوش نصیبی ہے کہ ایسی ہستی کے درشن ہو گئے۔ جس سے ہماری عقل اور علم میں اضافہ ہوگیا۔ بغیر بولے وہ خیالات سے واقف ہو جاتا ہے۔ بغیر چلے وہ سفر کر اسکتا ہے۔

محسن نے کہا۔ باوصف اس کے وہ خدا کے جلال سے کانپ اُٹھتا ہے۔

شہزادی نیلوفر۔ خالق کے ماسوا جو کوئی بھی ہے خواہ اس سے کروڑ خرقِ عادت افعال سرزد ہوں۔ آخر بے حقیقت مخلوق ہے۔

اس بزرگ نے اچانک سامنے آکر شہزادی کے سر پر پدرانہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ تم سچ کہتی ہو بیٹا غیر اللہ کی حقیقت کیا ہے۔ آؤ چلیں ایک پرانے آشنا سے ملیں۔

وہ بزرگ پھر آگے آگے ہولیا۔ ایک سنسان پرانے قبرستان میں پہنچے۔ رات کی تاریکی اور سناٹے نے منظر کو بے حد وحشتناک بنا رکھا تھا۔ وہ اونچے درختوں میں سے گذر رہے تھے خشک پتے ان کے پاؤں میں کرراہ رہے تھے۔ ہوا سرسر کرتی درختوں میں سے گذر رہی تھی۔ یہ تینوں اس پیرمرد کے ساتھ بے خطرہ جا رہے تھے۔ وہ ایک

ٹوٹی ہوئی پرانی قبر کے پاس کھڑا ہوگیا اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھاکر کہا خدا کے حکم سے اٹھ پھر اُس نے ایک دعا پڑھی۔ تینوں نے دیکھا قبر شق ہوگئی ایک شخص کلمہ پڑھتے ہوئے اُٹھا اور عربی میں کہا کہ میں تہجد پڑھ کر ذرا سو گیا تھا کیا صبح کی اذان ہوگئی۔

صبح کی اذان محسن نے تعجب سے کہا۔ میں تو ابھی مغرب کی نماز پڑھ کر آیا ہوں۔

اس شخص نے اس بزرگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ تمہارے ساتھی بے حد خوش مزاج ہیں کہ فجر کو عشا بتا رہے ہیں۔ یہ ہماری فوج کے آدمی تو معلوم نہیں ہوتے۔ غالباً راجہ دہر کے پشتیبان علاقی لوگ ہیں۔

اس بزرگ نے جواب دیا کہ دُور از کار باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا منشا اب کیا ہے۔

اجنبی۔ ہمارا منشا سوائے اسکے کوئی نہیں کہ یہاں کے نظامِ حکومت کو بدل کر لوگوں کے مجلسی اور اقتصادی حالات کو بہتر بنا دیا جائے تاکہ خدا کی مخلوق مبتلائے مصیبت نہ رہے۔ ملک گیری ہمارا مقصد نہیں۔ بزورِ شمشیر مذہب پھیلانا ہمارا نصب العین نہیں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو ہم شکست خوردہ راجاؤں کو یا ان کی اولاد

کو حکومت دوبارہ کیوں نہ دیدیتے۔ محمد بن قاسم کی ایک خوشی ہے کہ یہاں کے راجا اس امر کی ضمانت دیں کہ وہ غریبوں پر ظلم اور اچھوتوں پر ستم نہ ہونے دینگے۔ اور اخوت و مساوات کے اسلامی اصول کو قبول کر لیں گے۔

بزرگ۔ اگر یہ بات قابلِ قبول نہ ہو۔

اجنبی۔ تو تلوار ہمارے اور اُن کے درمیان فیصلہ کریگی اسلام یہ امر برداشت نہیں کر سکتا کہ امیر اور غریب میں ایسا مجلسی اور اقتصادی تفاوت ہو۔ بلالحاظ مذہب و ملت ہم سب بنی آدم ہیں مجلسی طور پر کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔ غریب امیر کا دست نگر نہ رہنا چاہیئے۔

بزرگ۔ کیا راجا لوگ رعایا کے برابر سمجھے جائیں۔

اجنبی۔ ہمارے ہاں خلیفہ اخوت و مساوات کے اصول منوانے کے لئے ہے۔ یہاں کے راجاؤں کو بھی ایسا ہی ہونا پڑیگا۔ کسی کی خاندانی فوقیت پر کل مخلوق کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں کے راجا خوب جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے مرکزِ خلافت سے منگا کر کروڑوں روپے اس مہم پر خرچ کر دیئے۔ اگر مخلوق کی خدمت ہمارے پیشِ نظر نہ ہوتی تو یہ خرچ اور اتنی تکلیف کوئی

کیوں اٹھاتا۔ کیا اب ملک کے غربا کو امرا کے رحم پر چھوڑ کر چلے جائیں؟ شُودروں اور ویشوں کو برہمنوں اور کھتریوں کے بدستور حوالے رکھیں۔ میرے دوست ہمارا سردار محمد بن قاسم اس بات کو نہیں مانتا۔ ہم دو شرطوں پر واپس جا سکتے ہیں۔ ایک ہمارے ساتھ دوستی کا معاہدہ کیا جائے۔ دوسرے اپنی رعایا کی بہبودی کیلئے تمام محاصل خرچ کئے جائیں۔ ان نسلی اور اقتصادی سرحدات کو جو انسان اور انسان کے درمیان تفریق کا باعث ہیں توڑ دیا جائے یعنی سب بنی نوعِ انسان کو برابر کا بھائی تصوّر کیا جائے۔

بزرگ۔ تم جانتے ہو کہ راجاؤں کی موجُودہ نسل سے یہ ممکن نہیں کہ وہ صدیوں کے تعلقات کو چھوڑ کر شودر اور ویش کو برابر کا سمجھنے لگیں۔ مَیں خود تمہارے اصولوں کا ہمدرد ہُوں مگر موجودہ حالات میں اتنا ہی ممکن ہے کہ آئندہ اسلامی تجارتی جہازوں کی حفاظت کا وعدہ کیا جائے اور پُرامن ہمسائے کی طرح رہنے کا یقین دلایا جائے۔

اجنبی۔ اور مظلوم آبادی کو ان کے حال پر چھوڑ جائیں۔ یہ ممکن نہیں اس ملک کے اقتصادی حالات مظلوم رعایا کی کیفیت دربارِ خلافت تک جا پہنچی ہے۔ ہم مسلمان انسانوں کو امرا اور روسا کی بھیڑیں

نہیں سمجھتے کہ بلا سیاسی وجوہات کے عام حالات میں جیسا چاہیں سلوک کریں۔ امن پسند آبادی سے یہ غیر منصفانہ سلوک خلافت کے لئے برداشت کرنا ناممکن ہے۔ حجاج بن یوسف کی تازہ ہدایت یہ ہے کہ رعایا کے حال کو بہتر بنانے شودروں اور رویشوں کو اپنانے کے عہد کے بغیر کوئی واپس نہ آئے۔

بزرگ۔ بہت اچھا میں تمہارے انکار کی خبر راجاؤں کو پہنچاتا ہوں اور تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ابھی میرا انتظار کریں۔ تلوار کو میان سے نہ نکالیں ممکن ہے کہ اب بھی کوئی صلح کی صورت نکل آئے۔ البتہ اصحاب کہف کی کہانی کو ذہن نشین رکھنا۔

اجنبی۔ صلح جنگ سے بہتر ہے۔ میں فوج میں تمہاری واپسی کا انتظار کرونگا۔ مگر آپ نے یہ غیر مربوط بات کیا کہہ دی کہ اصحاب کہف کی کہانی کو یاد رکھنا۔

بزرگ۔ اس کا ربط میں آئندہ ملاقات پر عرض کروں گا۔ لو خدا حافظ۔

اجنبی شخص جو ابھی قبر سے اٹھا تھا خدا حافظ کا جواب خدا حافظ سے دیکر ان سے الگ ہو کر چلا گیا۔ شہزادی نے سوال کیا کہ بابا یہ گفتگو ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

بزرگ بولا تم اس کے پیچھے جاؤ۔ یہ اپنے وقت کا معزز شخص

ہے اس کے ساتھ رہو اس کو مالی تکلیف نہ ہونے دو اس کو ہندوستان کے ضروری مقامات کی سیر کراؤ۔ اس کا علم اور عمل آپکے لئے مفید رہے گا۔ مَیں مناسب موقعہ پر پھر ملوں گا۔

بزرگ اس گفتگو کے بعد چند قدم چلتا ہُوا نظر آیا پھر غائب ہو گیا۔ اندرما شہزادی نیلوفر اور محسن تینوں اس صاحب قبر کے پیچھے پیچھے چلے۔ وہ اِدھر اُدھر گھبرا گھبرا کر رستہ دیکھتا جاتا تھا۔ جوں ہی اس نے اِن تینوں کی آہٹ پائی وہ ٹھہر گیا۔ اور قریب پہنچے تو اس نے پوچھا "ہماری فوج کوچ کر گئی"؟

کون سی فوج محسن نے تعجب سے پُوچھا۔

عربی فوج یعنی محمد بن قاسم کا لشکر، اجنبی نے کہا۔

وہ تو دُنیا سے ہی کب کی کوچ کر گئی۔ اندرما نے شوخی سے جواب دیا۔

تم نامسلمان معلوم ہوتے ہو تمہاری تلخ باتوں کا بھی کوئی رنج نہیں۔

اندرما خود ہی بات کر کے شرمندہ ہو گئی اور عذر خواہ ہوئی۔

اجنبی نے کہا۔ خدا تمہیں ہدایت دے مَیں نے تمہارا عذر قبول کیا۔ اگر تمہیں معلوم ہے تو میری بات کا جواب دو۔

سب نے کہا کہ محمد بن قاسم کو اس جہاں سے کوچ کئے بارہ سو سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ آپ اب اسکی فوج تلاش کر رہے ہیں۔

صاحب قبر نے کہا راہنمائی کرنا اجرِ عظیم کا باعث ہوتا ہے ہر شخص دل لگی کے لئے موزوں نہیں۔ ہاں وہ سامنے روشنی ہو رہی ہے۔ غالباً خیمے یہاں سے اُکھاڑ کر وہاں لے جائے گئے ہیں معلوم نہیں یہ کیوں کیا ابھی بہت رات باقی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مَیں جلدی تہجّد پڑھ کر سو گیا تھا۔ مگر خیمے کسی خطرہ کی بنا پر یہاں سے اُٹھائے گئے؟

وہ جلد جلد موجُودہ ملتان شہر کی طرف قدم اٹھاتا چلا۔ شہر کے قریب پہنچ کر آبادی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے محسن کو مخاطب کر کے پھر پوچھا کہ کونسی آبادی ہے۔ مَیں کہاں کا کہاں آ گیا ہُوں کیا کوئی مسلمان یہاں بستا ہے؟

شہزادی نے کہا "یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے"۔

اجنبی نے پھر اسے مذاق سمجھا اور کہا دوست کچھ مَیں خود پریشان ہوں کچھ تم پریشان کرتے ہو۔ ہمارے شمار کے مطابق اس سارے ملک میں زیادہ سے زیادہ ہزار مسلمان ہونگے۔

محسن۔ مگر اس شہر میں کم از کم بیس ہزار کلمہ گو موجود ہیں۔ یہ علمی بحث

کی بات نہیں۔ یہ واقعہ ہے۔ اس آبادی کے کسی آدمی سے آپ دریافت کر سکتے ہیں۔

وہ لپک کر ایک دکان پر گیا۔ آدھی عربی آدھی پرانے وقتوں کی پنجابی زبان میں پوچھا۔ کہ یہاں کتنے مسلمان ہیں۔

اُس نے اِس کو بھیک مانگنے والا عرب سمجھ کر مسجد مسجد کہا۔ یعنی ہدایت کی کہ مسجد میں جا کر مانگو۔

اجنبی اب راہ میں حیران کھڑا تھا۔ رات زیادہ ہو رہی تھی۔ اُس نے پھر جرات کر کے ایک شخص کو مخاطب کیا۔ وہ اس انوکھی زبان سے ناواقف تھا۔ وہ چپ چاپ چلتا بنا۔

ان تینوں نے مناسب سمجھا کہ اسے رات اپنے ساتھ شب باش ہونے کی دعوت دیں۔ چنانچہ اسے ہوٹل میں ساتھ چلنے کو کہا گیا۔ اس نے کہا کہ میں جب تک یہ معمہ حل نہ کر لوں تب تک کسی کے پاس کیسے جاؤں۔

اتنے میں مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ اجنبی پھر بھی اسی تصور میں تھا کہ صبح ہونے والی ہے۔ جب اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کے الفاظ نہ آئے تو وہ گویا پھر خواب سے بیدار ہو گیا۔ اور کہنے لگا مجھے کچھ غلطی لگی ہے۔ شاید میں مغرب کے بعد سویا ہونگا۔

لیکن یہ اذان کہاں سے آئی ہے۔ اسلامی فوج ضرور اسی جگہ ہو گی ورنہ کفرستان میں اذان کہاں۔ وہ اذان کی آواز پر بڑھا اس نے تھوڑی دُور جا کر مسجد کے محراب دیکھے اور بھی متعجب ہُوا۔ کچھ لوگ وضو کر رہے تھے اُس نے ان سے جا کر ملی جلی عربی اور پنجابی زبان میں پوچھا کہ اسلامی لشکر کہاں ہے۔ مخاطب نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا سمجھا کہ دیوانہ ہے۔ ملتان میں بیٹھ کر اسلامی لشکر کی خبر پُوچھتا ہے۔ اس جہالت کا جواب اس نے خاموشی سے دینا مناسب سمجھا۔

اُس نے کھسیانہ سا ہو کر دراز ریش بزرگ سے یہی سوال عربی میں پُوچھا۔ یہ دراز ریش بزرگ امام مسجد تھے، عربی سمجھتے تھے۔ مگر وہ اسلامی لشکر کا پتہ کیا بتلاتے۔ اس کی طرف حیران ہو کر دیکھنے لگے۔ اُس نے پھر اصرار سے کہا کہ مَیں محمد بن قاسم کا لشکر پُوچھتا ہُوں۔ امام مسجد نے جواب دیا کہ محمد بن قاسم کو گذرے بارہ سو سال ہو چکے ہیں۔

اجنبی نے بلند آواز سے کہا۔ تم نے یہ کیا سازش بنا رکھی ہے اور کیا بھروپ بنا رکھا ہے۔ یہ مسجد رات بھر میں کیسے بن گئی۔ کل تک یہاں کوئی مسجد نہ تھی۔ تم کہاں سے آئے ہو۔ عربی تم معلوم

نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں مسلمان کہاں؟ یہ کیسا مذاق ہو رہا ہے۔

امام مسجد نے سمجھا کہ اس کا دماغ ضرور چل گیا ہے۔ اس نے نماز کی نیت باندھ لی۔ صاحبِ قبر حیران ہو کر کھڑا سوچتا رہا۔ اتنے میں، نماز باجماعت کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی جلدی وضو کر کے شامل ہو گیا۔ حیران ہو کر سوچنے لگا یہ مسلمان بھی ہیں۔ ہمارے آدمی معلوم نہیں ہوتے۔ یہ آئے کہاں سے ہیں۔ نماز سے فارغ ہو کر اُس نے پھر امام سے پُوچھا کہ یہاں کتنے مسلمان رہتے ہیں۔ امام مسجد نے جواب دیا ۲۵ ہزار۔

"۲۵ ہزار"۔ صاحبِ قبر نے چونک کر کہا۔ تم بڑے کاذب ہو ۵ ہزار فوج کو لے کر ہم چلے تھے۔ اس ملک میں ڈیڑھ برس ہمیں آئے ہئوا۔ اس شہر میں ۲۵ ہزار مسلمان کیسے ہو گئے۔ اتنا کذب اور یہ مذاق؟

امام مسجد اسے سلام کر کے گھر چلتا بنا۔

شہزادی نیلوفر جو بلا کی ذہین تھی اسے کچھ سُوجھی اور صاحبِ قبر کو کہا۔ آؤ مَیں تمہیں محمد بن قاسم سے ملاؤں۔ وہ سخت پریشان تھا اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ شہزادی نے ایک تانگہ والے کو روکا۔ سب کو چڑھنے کے لئے اشارہ کیا۔ چاروں بیٹھ گئے۔

تانگے والے کو شہزادی نے کہا سٹیشن لے چلو۔ تانگہ اسٹیشن روانہ ہوا۔ عرب نے کبھی یہ سواری نہ دیکھی تھی۔ سارا راستہ حیران تھا کہ یہ کیا سواری ہے۔ اسٹیشن پر پہنچ کر جلدی سے شہزادی نے پلیٹ فارم خریدے اور اس حیران اور پریشان عرب کو ساتھ لیکر پلیٹ فارم پر آئے۔ اتفاق سے گاڑی آنے والی تھی۔ مسافروں کا ہجوم تھا۔ قلیوں کو اسباب اُٹھاتے لوگوں کو سفر پر تیار دیکھ کر اجنبی متعجب تھا اتنے میں گاڑی آتی دکھائی دی۔ زمین کانپ اُٹھی۔ ریل چیختی چلاتی پلیٹ فارم کے اندر آئی۔ اس اجنبی کے پاس ایک گنوار لٹھ کے سہارے کھڑا تھا۔ اجنبی نے ریل کہاں دیکھی تھی۔ قیاس کیا کہ ایسا شیطان ہی ہو سکتا ہے۔ گنوار کا لٹھ چھین کر اس شیطان ریل پر حملہ کرنے کے لئے بڑھا ھٰذا شیطان الرجیم کہہ کر وہ لٹھ چلایا ہی چاہتا تھا کہ محسن نے ہاتھ روک لیا۔ اور کہا کہ یہ شیطان مردود نہیں بلکہ مسافروں کو دُور دُور تک جلدی لے جانے والی سواری ہے۔

اس نے مسافروں کو اُترتے چڑھتے دیکھا۔ کچھ دیر کے بعد گاڑی وسل دے کر چل دی۔ چند منٹ میں حد نگاہ سے پار ہوگئی۔ اس نے کہا یہ شیطان عربی گھوڑے کی طرح تیز ہے۔ کیا گھوڑے اس کو کھینچ رہے ہیں۔

شہزادی نے کہا۔ نہیں یہ بھاپ کے زور سے چلتی ہے۔
اجنبی نے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔
شہزادی نے ریل کی ایجاد کی ساری تاریخ بیان کی۔
اجنبی نے کہا اس کا موجد خدا کے فضل سے ضرور مسلمان ہوگا۔
شہزادی نے کہا۔ وہ مسلمان نہ تھا۔
اجنبی نے غم سے گردن جھکالی۔
اجنبی کو پھر لشکر کا خیال آیا پھر پکار اُٹھا کہ ہمارا لشکر کہاں ہے لیکن اب خود ہی خاموش بھی ہو گیا۔ وہ سخت مضطرب تھا حالات کا صحیح طور پر اندازہ نہ لگا سکتا تھا۔ وہ تمام نئے مناظر کو خوابِ پریشان سمجھ کر کلمہ پڑھنے لگا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھا گویا اب خواب سے بیدار ہو چکا ہے۔ اس ماحول کو دیکھ کر اور بھی پریشان ہوا۔ جب سب اسٹیشن کے باہر نکلے وہ بھی دوسروں کے ساتھ تانگے پر سوار ہو گیا۔ اب اُس نے اپنے آپ کو قسمت کے حوالہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔
اور وہ بلا چون و چرا ان کے ساتھ ہوٹل میں آ گیا۔
وہ بے سرو سامانی میں ہوٹل پہنچے۔ اچھا ہوا کہ گرمی کا موسم تھا ورنہ زیادہ تکلیف ہوتی۔ وہ کھانا کھا کر فارغ ہوئے اور انہوں نے سو جانے کی کوشش کی۔ مگر آج کا واقعہ ایسا نہ تھا کہ دماغ سے تم

جائے۔ اجنبی مضطرب ہو کر ٹہلنے لگا۔ شہزادی باپ کی یاد میں رونے لگی۔ اندرما اور محسن بھی کروٹوں پر کروٹیں بدلتے تھے۔ آج کے سارے واقعات ان کے تصوّر کی فضاؤں میں موجُود تھے اور ایک ایک کر کے سامنے آتے تھے۔

انہوں نے جوُں توں کر کے رات کاٹی۔ شہزادی اور اندرما اُٹھ کر بازار گئیں۔ اور اسباب خریدا۔ اور واپس آئیں محسن اجنبی کو لیکر مزارات کی سیر کو گئے۔ کیونکہ ملتان میں گورستان ہی جاذبِ نظر چیز ہیں۔ اجنبی نے تعجب سے ایسے لوگوں کو کثرت سے دیکھا جن پر مسلمان ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ مساجد اور مقابر کی کثرت سے بھی اس نے یہی نتیجہ نکالا کہ اس آبادی میں مسلمانوں کا اندازہ ممکن ہے ۲۵ ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو مگر یہ کیا طلسم ہے۔ میری پہلی زندگی خواب تھی یا جو کچھ دیکھ رہا ہوں یہ وہم ہے۔ یہ بات میری عقل اور فکر سے بالا ہے۔

اتنے میں دونوں ایک درگاہ شریف میں داخل ہُوئے۔ وہاں زائرین کا ہجوم تھا۔ اکثر روضہ شریف کے سامنے سجدے میں پڑے تھے۔ کچھ حضرت سجادہ نشین صاحب کے گھٹنوں کو عزت و احترام سے چھُوتے تھے۔

اجنبی نے پوچھا یہ کس مذہب کے لوگ ہیں اور کس کی پوجا کر رہے ہیں۔

محسن نے کان میں کہا۔ یہ خدا کے فضل سے مسلمان ہیں۔

اجنبی کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اُس نے محسن کو مخاطب کر کے کہا۔ او نامسلمان مَیں مذہب کے بارے میں تمہارا مذاق برداشت نہیں کر سکتا

محسن نے اسی میں عافیت سمجھی کہ خاموش ہو کر اس کو اسی جگہ سے لوٹا لائے۔ اُس نے دل میں کہا۔ اگر مَیں اصرار کروں کہ یہ مسلمان ہیں تو خدا جانے یہ کیا ہنگامہ برپا کرے۔ ان کے جلدی لوٹ آنے پر اندرما اور شہزادی نے تعجب کیا۔ جب محسن نے معاملہ بتلایا تو شہزادی نے کہا۔ آپ نے بہت مناسب کیا۔ اب مناسب ہے کہ آج ہی لاہور چلے چلیں۔ کم از کم آرام دہ ہوٹل تو میسّر ہو گا۔ چنانچہ وہ نیا اسباب درست کر کے اسٹیشن پر آئے۔ دوسرے درجے کے کمرہ میں بیٹھ گئے۔ اجنبی چلتی گاڑی اور اس کے سامان کو تعجب سے دیکھتا تھا۔ کھیت اور درخت اس کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ چھوٹے بڑے شہر اور گاؤں اس کی نگاہ کے سامنے آتے۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں سے گاڑی زنّاٹے سے گذر جاتی۔ وہ سب مناظر کو مبہوت ہو کر دیکھتا رہا۔ شام سے پہلے گاڑی لاہور پہنچ گئی۔ اسٹیشن پر بیسیوں شیطان

شیطان اور اس کے چھوٹے بھائی یعنی انجن اور گاڑیاں کھڑی دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ مسافروں کی آمدورفت سے ایک ہنگامہ بپا تھا ترقی یافتہ شہر میں جو حالت ایک دہقان کی ہونا چاہیئے وہ اس کی تھی۔ وہ ہر قدم پر کھڑا ہو کر معاملات کا جائزہ لیتا اور مختلف الحال لوگوں کو دیکھ کر تعجب کرتا تھا۔ لوگوں کے اوضاع و اطوار اس کے لئے عجیب تھے۔ اس کی حرکات لوگوں کے لئے سامان دل لگی تھیں۔

انہوں نے پلیٹ فارم سے باہر آ کر ٹیکسی کرایہ پر لی۔ شہزادی نے ڈرائیور کو مخاطب کر کے سیسل ہوٹل کا نام لیا۔ ٹیکسی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اجنبی ٹانگے کو تعجب سے دیکھتا تھا۔ ٹیکسی کو چلتے دیکھ کر بالکل حیران رہ گیا۔ محسن نے از راہ تمسخر کہا کہ یہ شیطان مردود یعنی ریل کا بچہ ہے۔

وہ ہوٹل میں سامان رکھ کر اور غسل کر کے شام کی سیر کو ٹیکسی پر نکلے۔ شہر اور مضافات میں عجب چہل پہل تھی۔ بے نقاب حسن ہر طرف رنگ و نور برسا رہا تھا۔ ہندو عورتیں کمال آرائش سے تیتریاں بنی اِدھر اُدھر جا رہی تھیں۔ ان کے چہروں کی جاذبیت غضِ بصر کے حاملوں کو بھی آنکھ چرا کر دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ ٹھنڈی سڑک سے ہوتے ہوئے چڑیا گھر پہنچے۔ اجنبی انواع و اقسام کے چرند و پرند

کو دیکھ کر بہت محظوظ ہُوا۔ ارد گرد کے باغ گو اس کے حسنِ مذاق پر پُورے نہ اترتے تھے۔ تاہم درختوں کے درمیان گھاس کے صاف میدان پر عورتوں اور مردوں کے ٹینس کھیلنے کا نظارہ اسکے لئے فرحت افزا تھا۔ ناگاہ چند مسلمان بیبیاں رنگارنگ برقعے پہنے سامنے سے گذریں۔ اُس نے چلتے پھرتے چھوٹے چھوٹے خیموں کو دیکھکر تعجب سے پوچھا یہ کیا ہے۔ اندرا نے بتایا کہ یہ مسلمان خواتین ہیں۔ اجنبی نے پھر پوچھا کہ وہ جو کھیلتی ہیں؟ جواب دیا گیا کہ وہ غیر مسلم ہیں۔

اچھا، اجنبی نے کہا جو اس طرح ہیں وہ غیر مسلم ہیں جو اس طرح ہیں وہ مسلمان ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تھوڑے سے مسلمان ہیں۔

محسن نے کہا۔ نہیں یہاں تین لاکھ کے قریب مسلمان ہیں۔

"تین لاکھ"، اجنبی یہ کہہ کر دم بخود ہو گیا اور محسن کی طرف ٹک ٹک دیکھنے لگا۔

ٹیکسی ڈرائیور شہر کے باہر باہر شاہی مسجد اور قلعہ کی طرف آیا۔ ہر دو مقامات پر ایک نظر ڈال کر اجنبی باغ باغ ہو گیا۔ اسے بتایا گیا بادشاہ اورنگ زیب کی تعمیر ہے۔ اُس نے اورنگ زیب کا کبھی نام نہ سنا تھا۔ پھر سب کا منہ تکنے لگا۔ نماز مغرب مسجد شاہی میں ادا کی گئی۔ اجنبی مسجد میں اس طرح آسودہ معلوم ہوتا تھا گویا ماہئ بے آب تڑپ

تڑاپ کر کہیں پھر اچانک گہرے پانیوں میں آگئی ہو۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ شہر میں سے ہوتے ہوئے لوٹے۔ بجلی کی روشنی سے شہر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ بازار مالِ تجارت سے پُر تھے۔ وہ اس دلچسپ سیر سے بہت ہی خوش تھا۔ یہ سُن کر سب کو اور بھی خوشی ہوئی کہ صبح عید بقر ہے۔ آج رات سب کی طبیعتوں میں قدرے سکون تھا۔ وہ رات کے ابتدائی حصہ میں ہی سو گئے اور صبح اُٹھے۔ سیسل ہوٹل کے اس کمرہ میں جہاں اندرما شب باش تھی ٹیلیفون لگا ہوا تھا۔ شہزادی کو شرارت سُوجھی اندرما سے ساز باز کر کے مینجر کے کمرہ میں گئی۔ وہاں سے اندرما کو بلایا کہ وہ اس اجنبی کو ٹیلیفون پر بُلا لائے۔ اندرما مسکراتی ہوئی اٹھی اور اجنبی کو بلا لائی۔ اور کہا آپ کو کوئی بلاتا ہے۔ اور خود ہی اس کے کانوں سے ٹیلیفون لگا کر کھڑی ہو گئی۔

اجنبی نے اس آلہ میں انسانی آواز سنی جو فصیح عربی میں خیر خیریت دریافت کر رہی تھی۔ اُس نے دل میں کہا فرشتہ تو اب انسان سے ہم کلام نہیں ہو سکتا۔ ضرور یہ شیطان ہے جو مجھے بہکانے کے لئے بول رہا ہے۔ وہ **ھذا** صوت الشیطان کہہ کر الگ ہو گیا۔ اور اندرما کے ہاتھ سے آلہ لے کر زمین پر دے مارا۔ اور اس کو پاؤں مار مار کر توڑنے لگا۔ وہ اونچے اونچے اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

کہتا جاتا تھا۔ اور پاؤں اور زور سے مار کر اس کو توڑ تا تھا۔ اندرا ہنسی ضبط نہ کر سکی باہر چلی گئی محسن اور شہزادی کو ساری کیفیت بتلائی۔ اب تینوں اندر آئے۔ اجنبی بزعم خود شیطان کو پامال کرنے میں مصروف تھا۔ وہ اس مہم کو کامیابی سے سر کر کے یعنی آلہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سب کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ یہ زندگی میں پہلا موقعہ ہے کہ میں شیطان سے ہمکلام ہوا ہوں۔

اندرا محسن اور شہزادی تینوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ برابر ہنسی ضبط کر رہے تھے۔ مبادا اجنبی ناراض ہو جائے۔

آخر محسن نے اس کو بتایا کہ آپ نے بڑے کام کی چیز توڑ کر رکھ دی۔ اس میں شیطان کی آواز بند نہیں۔ بلکہ اسکے ذریعے انسان دور دراز تک آواز پہنچا سکتا ہے۔ اور دوسرے کی آواز سُن سکتا ہے۔ اجنبی کو ٹیلیفون کا سارا سلسلہ سمجھانے میں دیر لگی۔ جب بات اسکی سمجھ میں آگئی تو اُس نے پُوچھا کہ یہ آلہ کسی مسلمان نے ایجاد کیا ہے۔ جب اسے نفی میں جواب دیا گیا تو وہ تاسف کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے کچھ ناشتہ کیا۔ محسن اور اجنبی نماز عید ادا کرنے کے لئے شاہی مسجد کو روانہ ہُوئے۔ مسلمانوں کا ہجوم دیکھ کر اجنبی سجدے میں گر گیا۔ ہندوستان اور مسلمانوں کا یہ اجتماع۔ وہ دیر

تک سجدۂ شکر میں پڑا رہا۔ لوگ اسے تعجب سے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ سجدے سے اُٹھا۔ اتنے میں جماعت کھڑی ہوگئی۔ آلاتِ جہیر الصّوت نصب تھے۔ بغیر مکبّر کے تکبیریں سنی گئیں۔ اجنبی حیران تھا کہ ایک آواز اتنی بلند کیونکر ہو سکتی ہے کہ اتنی دُور سنی جا سکے۔ اس کے بعد خطبہ شروع ہوا اُس نے آواز کو اتنی بلند پا کر ادھر اُدھر دیکھا پھر خطبہ سننے لگا۔ خطبہ میں کسی خلیفۂ وقت کا نام نہ آیا اور خطبہ ختم ہو گیا۔ لوگ اُٹھنے لگے۔ اجنبی عربی میں پکارتا ہوُا اُٹھا کہ نمازِ عید اکارت گئی اور گناہ لازم آگیا۔ امام خطبہ میں خلیفۂ وقت کا نام لینا بھُول گیا۔ زبان عربی کے واقف اور ناواقف دونوں اسکی پکار پر حیران تھے۔ وہ برابر اپنی سی ہانکے جاتا تھا۔ اور اس غلطی پر آپے سے باہر تھا۔

کسی نے کہا اے شخص دیوانہ ہوُا ہے۔ خلافتیں ختم ہو گئیں وہ تو نام بھی باقی نہ رہا۔ تو نے کس تہ خانہ میں پرورش پائی ہے۔ بھلے آدمی بے سبب یہ کیا اُودھم مچا رکھا ہے۔ لوگوں نے بھی اسے دیوانہ اور مجنون کہہ کر پکارنا شروع کیا۔ وہ پھر بھڑک اُٹھا اور کہا او نامسلمو! بظاہر نماز پڑھ کر یہ منحوس کلمہ زبان سے نکالتے ہو کہ خلافت کا نام بھی باقی نہیں رہا اور اس پر مجھے مجنون پکارتے ہو۔

سب نے جانا کہ یہ سر پھرا اور معذور ہے۔ دو ایک نے محسن کو پوچھا کیا تمہارا ہمراہی دیوانہ ہے؟

محسن نے کہا دیوانہ تو نہیں مگر اس کی حرکات ایسی ہی ہیں۔

اتنے میں ایک نے کہا لیجئے یہ امام صاحب آگئے ہیں۔ اجنبی اب امام صاحب کے گرد ہو گیا۔ امام نے کہا جب کوئی خلیفہ نہ رہا ہم محکوم ہو گئے تو کس کا نام خطبہ میں لیں۔ اجنبی نے کہا ۳۰ ہزار مسلمان ملتان میں ۳ لاکھ اس شہر میں پھر مسلمان محکوم کس کے ہو گئے۔

امام نے کہا ۳۰ ہزار اور تین لاکھ کی بھلی کہی۔ ہندوستان میں آٹھ کروڑ فرزندانِ توحید ہیں مگر غلام۔

اجنبی آگ بگولا ہو گیا۔ اور امام مسجد کی ناک پر اس زور سے مکّہ مارا کہ امام لہولہان ہو گیا۔ آٹھ کروڑ فرزندانِ توحید اور غلام؟ اور تیرے جیسا کاذب اس شاہی مسجد کا امام۔ غور کرو مسلمانو! اس نے عربی میں لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ایسے منحوس کلمات کہنے والا کبھی کسی مسجد کا امام ہو سکتا ہے۔ او نا مسلمان امام! خدا کے حضور میں تیری سب عبادتیں اس ایک کلمہ ناسزا کے باعث ضائع ہو گئیں۔ آٹھ کروڑ فرزندانِ توحید کی غلامی کا تصوّر بھی ایمان کو برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔ چہ جائیکہ کوئی ایسا کلمہ زبان پر لائے

سب نے کہا ہے تو دیوانہ مگر بات پتے کی کہہ گیا ہے۔ اجنبی کی یہ بات لوگوں کو بھا گئی۔ ورنہ پاگل سمجھ کر دھر لیا جاتا محسن نے خیریت اسی میں دیکھی کہ اس کو جلدی ٹیکسی میں بٹھا کر لے چلے۔

محسن جب اجنبی کے ساتھ ہوٹل میں واپس آیا تو اس نے مسجد کی سرگذشت کہہ سنائی اور کہا کہ عجب حال ہے اسکے ذہن میں یہ بات بھی نہیں آتی کہ اتنے مسلمان غلام کیسے ہو سکتے ہیں۔

اندرمانے کہا۔ اے بزرگ تمہیں معلوم ہے کہ میں مسلمان نہیں لیکن یہ تمہیں بتا دوں کہ تم صرف ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کی غلامی کے تصوّر کو برداشت نہیں کر سکتے۔ حالانکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ دنیا کے ۷۰ کروڑ مسلمان غلامی اور نیم غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مرکزِ اسلام یعنی عرب کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں۔

تم عورت ہو اجنبی نے جلال میں آکر کہا۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو جان سلامت لیکر نہ جاتی۔ مرکزِ اسلام اور نیم غلام؟ لڑکی تو میری اسلامی رواداری کا بہت ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے۔ جا اس گستاخی پر بھی میں نے تمہیں بخش دیا۔

اندرمانے کہا۔ بزرگ تم بھلے وقتوں کی نشانیاں ہو۔ اس شہر لاہور کے تین لاکھ مسلمانوں میں سے کسی سے جا کر دریافت کر دو وہ

میری اور امام کی بات کی تصدیق کی گواہی دے گا۔ ہرچند تمہیں یہ ناگوار خاطر ہو لیکن حقیقتِ حال یہی ہے کہ دنیا کے مسلمان کی حالت بہت زبون ہے۔ ہندوستان کا ملک خود پھر کر دیکھو ہر مسلمان اپنی غلامی کا اقرار کرے گا۔

اجنبی۔ لڑکی میں آخری بار کہتا ہوں کہ میں یہ باتیں نہ یقین کر سکتا ہوں۔ نہ مجھے برداشت ہو سکتی ہیں۔ اپنی مہمان نوازی کا عوض میری مذہبی غیرت کے امتحان سے نہ لو۔

معزز مہمان اندر ما بولی۔ میں معافی مانگتی ہوں مجھے یہ امید نہ تھی کہ آپ حقیقت نفس الامری پر ناراض ہو جائینگے۔

اجنبی۔ دو اور دو کا پانچ ہونا مان سکتا ہوں لیکن ستّر کروڑ چھوڑ سات کروڑ چھوڑ سات لاکھ مسلمان کا کل دنیا سے مغلوب ہونا یقین نہیں کر سکتا۔

اس وقت شہزادی مینجر ہوٹل سے ریڈیو کا سٹ لے آئی اور کمرے میں لگا دیا۔ عراق کی کوئی خوش گلو بغداد کے مرکز سے عربی ترانہ گا رہی تھی۔ اجنبی نے حیران ہو کر دیکھا تعجب سے آواز کو سنا۔ دو دن کی ذہنی کوفت کے بعد خوش آواز اور ساز نے جادو کا کام کیا۔ وہ لذتِ نغمہ سے جھوم گیا۔ اور سرور میں آ کر آنکھیں بند کر لیں۔

فضا میں مستی برس رہی تھی کچھ دیر وہ کیفیت نغمہ میں کھویا رہا۔ جب راگ ختم ہو گیا تو فلسطین کے ہائی کمشنر کی طرف سے عربوں کو تنبیہ کا اعلان ہؤا کہ وہ خلاف قانون سرگرمیوں سے اجتناب کریں۔

اس اعلان سے اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس نے دریافت کیا یہ کیا معاملہ ہے۔

محسن نے کہا۔ مہمانِ عزیز اگر تم اطمینان سے بات سنو تو سارا معاملہ بیان کیا جائے فلسطین پر انگریز کی حکمبرداری ہے۔ ان ہی کے حکم سے یہودیوں کو وہاں دھڑا دھڑ آباد کیا جا رہا ہے۔ عرب اپنی عافیت کے خوف سے صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔

اجنبی۔ کیا دوسرے اسلامی ممالک امداد نہیں کرتے

محسن۔ اسلامی ممالک کی بھی ایک ہی کہی۔ وہ تو انگریزی جبروت کے مقابلہ میں کھانڈ کے کھلونے ہیں۔ یہ تو خدا کا احسان ہے کہ عیسائی حکومتیں آپس میں برسر پیکار ہیں۔ ورنہ نیم آزاد اسلامی ممالک ان کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

اجنبی نے محسن سے کہا کہ میزبانِ عزیز تم نمازیں پڑھتے ہو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہو۔ خدا کی قسم کھا کر کہو کہ آیا واقعی مسلمان ہندوستان میں سات کروڑ ہیں۔ اور واقعی دنیا کے مسلمانوں کی تعداد

ستّر کروڑ ہے۔

محسن نے کہا اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے دنیا کے مسلمانوں کی یہی تعداد بتائی جاتی ہے۔ اور ہندوستانی مسلمان بھی سات آٹھ کروڑ سے کم نہیں۔

اجنبی۔ اور وہ سب غلام ہیں۔

مُحسن۔ سب نہیں۔ مگر ان کا بیشتر حصہ غلام ہے۔ اور باقی عیسائی حکومتوں کے زیر اثر ہیں۔

اجنبی کی آنکھوں سے خُون ابلنے لگا۔ وہ اُٹھ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اُسے کثرتِ غم سے تشنّج شروع ہو گیا۔ وہ انگڑائیاں لیتا تھا اور کہتا تھا یہ جھوٹ ہے۔ بالکل جھوٹ ہے۔ اگر سچ بھی ہو تو بھی میں اپنی زندگی میں سننا گوارا نہیں کر سکتا۔ لحظہ بلحظہ اس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اُس نے بڑی تشویش کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ اس سے کوئی غم کی بات نہ کی جائے۔ لیکن باوجود احتیاط کے تمام رات تشنج اور ہذیان میں مبتلا رہا۔ وہ برابر یہی کہتا تھا کہ اتنے مسلمان اور غلام یہ ممکن نہیں۔ اے خدا میرے کان کیا سنتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو مُجھے موت آنا بہتر ہے۔ غضب ہے کہ دُنیا کے مشہور موجد غیر مسلم ہوں۔ اور خدا کی زمین کی بادشاہت سے بھی مسلمان محروم ہوں

نہیں اسلام کا دعویٰ کرنے والے مسلمان نہیں رہے۔ ورنہ اتنی تعداد میں ہو کر غلام کیسے رہتے۔

معالجہ برابر جاری رہا۔ دوسرے روز کچھ افاقہ ہوا۔ شام تک طبیعت رو بہ اصلاح ہو گئی۔ لیکن پُورا ایک ہفتہ نقاہت کے باعث بستر پر پڑا رہا۔

اجنبی نے دل میں کہا میں صاحبِ سیف ہو کر عورت سے بدتر ہو گیا ہُوں۔ ناموافق ماحول میں یُوں گھبرا جانا مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ مَیں زندگی کے پہلے مناظر کو دل خوش کن خواب کیوں نہ سمجھ لوں۔ اور اب مسلمان کی جدوجہدِ حیات میں نئی روح پھونکنے کا باعث کیوں نہ بنوں۔ اس خیال سے وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ جب محمد بن قاسم کے فاتحانہ اقدامات کا خیال بھی آتا تو وہ طبیعت کے رُخ کو بدل دیتا۔ اور اپنے موجودہ ماحول کی فلاح و ترقی پر غور کرنے لگتا تھا اب وہ بہت زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ ہر معاملہ کی خود دریافت اور تحقیق کرنے لگا اور اُس نے پُرانے خیالات کو بھلا دیا۔ لیکن وہ طبیعت کی ایک اُلجھن کو دُور کرنا چاہتا تھا اور وہ یہ تھی کہ ان تینوں میزبانوں کے ساتھ جو چوتھا شخص تھا وہ لازمی طور پر مجھ سے ملاقات کر چکا ہے۔ اور اسی کی ملاقات کے لئے مَیں اسلامی لشکر سے الگ ہُوا

تھا۔ اس نے اس ملاقات میں بھی پہلی ملاقات کے سلسلہ مباحث کو جاری رکھا تھا۔ اُس نے مجھے جھٹلانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بلکہ یہ کہا کہ مَیں راجاؤں سے استصواب کر کے تھوڑے عرصہ میں جواب دوں گا۔ وہ اتنی ملاقاتوں میں کبھی جھوٹا ثابت نہیں ہوُا۔ وہ فہیم ترین شخص ہے۔ وہ کم گو اور محتاط ہے۔ ایسا آدمی خفیف الحرکت نہیں ہو سکتا۔ بہتر ہے کہ مَیں اس شخص کے متعلّق اِن تینوں سے دریافت کروں۔

اندرما شہزادی اور محسن تینوں اتفاق سے پاس ہی موجُود تھے۔ اجنبی نے اس بزرگ کے متعلق استفسار کیا۔ شہزادی نے ساری دفینے کی اور متعلقہ تحریر کی کہانی سنائی اور بغداد سے پہاڑ تک کا سفر بیان کر کے اس بزرگ سے ملاقات پر بات ختم کی۔

اجنبی نے کہا غیر فانی مخلوق کا مَیں قائل نہیں۔ اللہ باقی ہے باقی سب فانی ہیں۔ البتہ طویل عمر کو مجازاً غیر فانی کہہ دینے میں ہرج نہیں۔ اب معمہ حل ہو گیا اور اُلجھن دُور ہو گئی۔ اصحابِ کہف کا ماجرا مجھ پر گذرا ہے۔

محسن نے کہا معزز مہمان تیری اپنی کہانی ہمیں حیرت میں ڈال رہی ہے وہ ہمیں سنا کہ ہمارے تعجب میں کمی ہو۔

اجنبی کی کہانی

مَیں حجاج بن یوسف کا ہم مکتب تھا۔ جب خلیفہ عبدالملک نے حجاج کو مشرقی ممالک کا والسرائے مقرر کیا تو حجاج نے مجھے اپنے علمی مشاغل ترک کر دینے پر اصرار کیا۔ اور محمد بن قاسم کے ہمراہ ہندوستان جانے پر آمادہ کیا۔ محمد بن قاسم ہر چند نوجوان تھا مگر شیر دل اور صائب الرائے تھا۔ ہندوستان کی مہم کی سرداری کے لئے نظر انتخاب اس پر پڑی۔ راجہ داہر جو مغربی ہندوستان کا باجبروت راجہ تھا مسلمانوں کے اقدامات کو خطرے کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ اپنی قوت کے مقابلہ میں کسی ہندوستانی حریف کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اسی طرح وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی مشرقی قوت میں کسی طرح انتشار پیدا کیا جائے۔ ہندوستان سونے کی چڑیا تھی۔ یہاں غیر محدود ذرائع آمدنی دنیا پر قابض ہونے کے لئے کافی تھے۔ راجہ داہر تھکا دینے والی جنگ کا آغاز کرنے کا موقعہ تلاش کرتا تھا۔ وہ مسلمانوں کے مشرقی باغیوں کو خوشی سے پناہ دیتا تھا تاکہ اس کے فاتحانہ اقدامات میں وہ مفید ثابت ہوں۔ حجاج بن یوسف عقابی نظر رکھتا تھا۔ وہ دور سے بیٹھا راجہ داہر کی حرکات کو تاڑ رہا تھا۔ اُس نے خلیفہ سے ہندوستان

پر مہم بھیجنے کی بار بار اجازت مانگی لیکن معمولی عذرات کی بنا پر ممالک کو تاخت و تاراج کرنا اسلامی حکمت عملی کے خلاف بات تھی۔ اس لئے ہر بار انکار کر دیا گیا۔

جزیرہ مالدیپ کا راجہ مسلمان ہو چکا تھا۔ اس نے دار الخلافت میں تحائف اور حاجیوں سے بھرے آٹھ جہاز روانہ کئے جو راجہ کے اشاروں سے لُوٹ لئے گئے۔ حاجیوں اور ان کے بال بچوں کو اسیر بنا کر راجہ دھانی میں بھیج دیا گیا۔ حجاج بن یوسف نے دوستانہ طور پر انکی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن بجز ذلت کے حجاج کو کچھ حاصل نہ ہوا۔ ناچار اُس نے محمد بن قاسم کو ہندوستان کی مہم کا سردار بنا کر پانچ ہزار مجاہد ہمراہ کئے۔ مَیں نے زندگی علمی مشاغل میں بسر کی تھی۔ اس وقت تک جہاد کے شرف سے محروم تھا۔ مجھ پر انگلیاں اُٹھتی تھیں کہ میں عمر بھر شریک جہاد نہیں ہُوا۔ مجھے خود احتمال پیدا ہو گیا مبادا بغیر جہاد میں شامل ہوئے مر جاؤں۔ اس لئے حجاج کے مشورہ کو قبول کر لیا۔ ہندوستان آکر یہاں کا باوا آدم نرالا دیکھا۔ ہندوستانی مختلف درجوں میں تقسیم تھے علم کی دولت برہمن کی قسمت تھی اور ملک کی سرداری راجپوت کرتے تھے۔ ویش صنعت و حرفت سے پیٹ پالتے تھے۔ شودر خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ ہمارے ساحل ہند پر قدم رکھتے ہی شودروں اور

ولیشوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ جب ہم نے ہر لحاظ سے اُن کے ساتھ برادرانہ سلوک کیا تو وہ ہماری معاشرت کے گرویدہ ہو گئے اور ہمیں اپنی قوم کا نجات دہندہ سمجھنے لگے۔

راجہ کی فوج ہر چند تربیت یافتہ اور بہادر تھی لیکن غازیوں کے پُرجوش حملوں کی ان میں تاب نہ تھی۔ جو قوم شہادت کو زندگی کا معراج سمجھے اور موت کو زندگی پر ترجیح دے۔ اس کے مدِّمقابل بن کر کون آئے۔ یہاں کی فوجیں کیا موت بھی ہم سے منہ چھپائے پھرتی تھی۔ جب ہمارے فاتحانہ قدم کو روکنے والا کوئی نہ رہا تو حجاج کا حکم آیا کہ ملکوں کے فتح کرنے کی بجائے دلوں کو فتح کرو۔ راجاؤں سے صلح کی طرح ڈالو اور انہیں شودروں اور ویشوں کو برابر کا بھائی تصوّر کرنے پر زور دو اور کہو کہ انسانوں میں یہ فرق اچھا نہیں۔ ہم سب اولادِ آدم ہیں اور آدم مٹّی سے پیدا ہوا تھا۔ اس لئے حسب و نسب کا امتیاز چھوڑ کر ایک ہو جاؤ۔ شودر جب خدمت سے فارغ ہو جائیں ان کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ بھائی بند سمجھ کر ان سے رشتے ناطے کرو۔ صاحبِ ثروت لوگوں پر ٹیکس لگاؤ اور ان شودروں اور ویشوں کی تعلیم پر خرچ کرو۔ شودروں اور برہمنوں کا موجودہ فرق مٹاؤ۔ اگر وہ یہ مان جائیں تو اُن

سے دوستی کا معاہدہ کر کے لوٹ آؤ۔ دونوں مذاہب یعنی ہندو مسلمان کو آزاد چھوڑ دو۔ کہ وہ مذہبی رواداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے اپنے مذہب پر قائم رہیں اور دلیل سے اپنے مذہب کو منوائیں۔

اے عزیزو! یہ شخص جو تمہاری بیری پہلی ملاقات میں تمہارے ہمراہ تھا محمد بن قاسم کے پاس آیا اور کہا کہ میں اس ملک کے راجاؤں سے گفتگو کرا دیتا ہوں۔ محمد بن قاسم اس شخص کی گفتگو سے اس کے اخلاص کا قائل ہو گیا۔ اور مجھے سلسلہ گفتگو کا مختار بنا دیا گیا۔ مجھے خود اس شخص سے بے حد انس ہو گیا۔ یہ کم سخن اور تیز فہم تھا اس کے اوقات کی پابندی مسلمانوں کی طرح تھی۔ علاوہ ازیں یہ ہفت زبان تھا۔ ہمارے لئے سب سے بڑی سفارش یہ تھی کہ یہ ہمارے اس اصول کا بڑا دلدادہ تھا کہ دنیا میں دُوئی نہ رہے۔ بلکہ اسلامی اصول کے مطابق اخوت اور مساوات کی بنا پر حکومت چلائی جائے اور مذہب کو خدمتِ خلق کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس کو راجاؤں کے دربار میں بھی بے حد رسوخ حاصل تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جو اس شخص سے ملتا تھا اس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ نہ یہ خوشامد سے خوش ہوتا ہے نہ خائف ہوتا ہے۔

اس شخص کی معرفت یہاں کے راجاؤں نے قیمتی تحائف

نجے کر رخصت کر دینا چاہا لیکن محمد بن قاسم نے صاف کہہ دیا کہ ملک گیری یا زر کشی مطلوب نہیں۔ بلکہ ہماری ساری سعی مظلوم لوگوں کے لئے ہے۔ ہم بنی نوعِ انسان کے لئے آزادی کا پیغام ہیں۔ اگر تم ہندوستان کے راجا شودروں اور ویشوں سے برابری اور برادری کے سلوک کا یقین دلاؤ اور امرا پر بھاری ٹیکس لگا کر غریبوں کی حالت بہتر بنانے کا وعدہ کرو تو ہم اب لوٹ جانے کو تیار ہیں۔ ورنہ ہماری اور تمہاری قسمتوں کا فیصلہ کرنے والی تلوار ہے۔

اے عزیزو میں اسی ہدایت کی بنا پر اس شخص سے گفتگو کر رہا تھا۔ یہ راجاؤں کا ایلچی تھا اور میں مسلمانوں کا سفیر تھا ہمیں اپنے خبر رسانوں سے یہ خبر برابر ملتی رہی کہ یہ شخص ہماری شرط کو منوانے کے لئے مخلصانہ کوشش کرتا رہا لیکن راجا لوگ باوجود اس کی عزت و تکریم کے اس کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کرتے رہے لیکن مجھے کبھی کبھی تعجب ہوتا تھا ایسا جلیل القدر شخص اپنی کوششوں میں ناکام کیوں ہے۔ بہر حال صلح کے سلسلہ میں یہ ہماری آخری ملاقات تھی جو آپ کے سامنے ہوئی مجھے اس امر پر تعجب ہے کہ اُس نے یہ کیونکر کہہ دیا کہ میں راجاؤں سے آخری ملاقات کر کے پھر آؤں گا۔

پردہ جو دروازہ پر پڑا تھا خود بخود یوں اُٹھ گیا گویا کسی ملازم

نے داخل ہوتے وقت عزت سے اٹھایا ہوا ہے۔ تعجب کی کوئی بات نہیں اُس غیر فانی بزرگ نے کمرے میں اچانک داخل ہوتے ہوئے کہا۔ انسان ماحول سے بلند نہیں ہو سکتا۔ تم جو محمد بن قاسم کے ساتھ کشور کشائی کا عزم لے کر اُٹھے تھے اب ناموافق ماحول کو دیکھ کر بے کس عورت کی طرح مصروف غم ہو۔ اس وقت راجا اپنے ماحول سے اچانک بلند ہو کر اخوت و مساوات کے اسلامی تصوّر کو برداشت کرنے کے ناقابل تھے۔ آج پانسہ پلٹ گیا ہے۔ اس واقعہ پر بارہ سو برس گذر گئے ہیں مسلسل ٹھوکروں اور فن تعلیم نے ان راجاؤں کی اولاد کی فطرت کو روشن کر دیا ہے۔ اب وہ اسلامی اصول کو فطرت کا قاعدہ سمجھ کر ملک میں اخوت و مساوات کے علمبردار بن رہے ہیں۔ لیکن محمد بن قاسم کی اولاد فخر نسب اور مجلسی تعصبات میں سیّد پٹھان جولا ہے اور موچی کے امتیازات میں الجھی ہوئی ہے۔ تم اگر اسلام کے ان فرزندوں کو اخوت و مساوات کے اصول سمجھاؤ تو تمہیں وہی دقتیں پیش آئیں گی جو مجھے ہندو راجاؤں کو سمجھانے میں محمد بن قاسم کے وقت آئی تھیں۔ راجا اس وقت نہ سمجھے۔ خدا کا قہر محمود غزنوی کی شکل میں ان پر آیا اور پورے بارہ سو برس یہ ملک غیر ملکی حملہ آوروں کے گھوڑوں کے لکدکوب کے حوالہ رہا۔ ہندو سنبھل رہا ہے۔ اب مسلمان بگڑ چکا ہے

ہاں تو مَیں نے راجاؤں کے نام پر آخری ملاقات میں اس لئے گفتگو کی تھی کہ آپ کے سر پر جو صدیوں کے انقلاب گذر چکے ہیں ان کا آپ کو علم نہ تھا۔ اچانک اس سے باخبر کرنا مناسب معلوم نہ ہؤا۔ مبادا آپ مجھ سے اُلجھ جاتے۔ اس لئے میں نے اصحابِ کہف کی کہانی کی طرف غیر مربُوط اشارہ کیا تھا کہ آپ جیسا بالغ نظر جلدی معاملہ کی تہ کو پہنچ جاتا۔ ہاں مَیں عرض کر رہا تھا ہندو سنبھل رہا ہے اور مسلمان بگڑ چکا ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ ساحلِ ہند پر قدم رکھتے پہلا خطبہ تم نے یہ دیا تھا کہ

"ہندوستان بڑا ملک اور اس کی آبادی کیا۔ ہم میں سے ایک ایک مسلمان دنیا کی قسمت کو پلٹ دینے کے لئے کافی ہے۔ ہم دنیا میں اخوت و مساوات قائم کر کے دم لیں گے۔ یہ نسلی اور خاندانی امتیازات کا ملک غریبوں اور کمزوروں کا جہنم بن چکا ہے ہم اُسے رشکِ جناں بنائیں گے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے عوام کی خوشی لوٹ لی ہے ہم اس کی خوشی لوٹا دیں گے۔ عورتوں کو آزادی دیں گے۔ شودروں کو برہمن کے برابر تعلیم دلائیں گے اور بلا لحاظِ مذہب و ملت خدمت سے سب کو ممنونِ احسان کرینگے۔ ہم دنیا کے قدرتی رہنما ہیں۔ امن و آشتی کی بنا پر ہندوستان کو بھی سچائی کے

اصول پر چلائیں گے۔

مجھے تمہارا خطبہ یاد ہے وحید اور تمہیں علم نہ ہو۔ میں اس وقت خدا کے حکم سے دُور بیٹھا تمہاری آواز کو صاف سُن رہا تھا۔ اب خدا نے تمہیں زندگی اور فرصت دی ہے۔ اس فرصت کو غنیمت جانو مسلمانوں کے اصلاح حال کا بیڑا اُٹھاؤ۔ اپنی طرح مجھے تعجب کا موقعہ نہ دو کہ میں تمہاری طرح کہہ سکوں کہ ایسا جلیل القدر شخص اپنی نیک کوششوں میں ناکام کیوں ہے۔ یہ بچہ اور بچیاں جو تمہارے سامنے ہیں میری باتوں سے مطمئن نہیں۔ تم اپنے وقت کے بڑے عالم تھے اِن کے لئے تشفّی کا باعث ہو جاؤ۔ لو خدا حافظ۔

وہ دروازہ کی طرف پلٹا۔ پردہ پھر اسی طرح خود بخود اُٹھ گیا اور جب وہ چلا گیا تو پردہ گر گیا۔ شہزادی اُٹھ کر کہنا چاہتی تھی کہ پھر کب ملاقات ہو گی۔ باہر سے آواز آئی بیٹھی رہو بیٹیا۔ میں مناسب وقت پر پھر خود ہی آملوں گا۔ وہ دیر تک اس محیّر العقول شخصیت کے متعلق بات چیت کرتے رہے کہ آخر یہ کون ہے وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔

کتنے ہی دنوں کے بعد آج سب کی طبیعتوں میں سکون تھا۔ اس صاحبِ کشف و کرامات کی محیر العقول ملاقات

باپ کے غم اور اجنبی کے اودھم مچانے کے باعث شہزادی کو نہ معذرت کا ہوش تھا اور نہ محسن کو محبوب سے مل کر محبت کی سرگوشیوں کی فرصت تھی۔ آج کے سکون پذیر حالات طالب و مطلوب کو دعوت تھے۔ وقت کی مجبوری نے حسن کو عشق سے لاپروا بنا رکھا تھا۔ وہ اب ایک دوسرے کو شوقِ محبت سے دیکھنے لگے۔

شہزادی نیلوفر نے مسکرا کر کہا محسن میں تمہارے حسنِ سلوک کی ممنون ہوں کہ تم نے مجھے ملازم رکھا لیکن برابر کا سلوک کیا۔

محسن۔ اور میں شہزادی تمہارے کمال کا معترف ہوں کہ تم نے مرد کا پارٹ کامیابی سے ادا کیا۔

اندرما۔ اور میں اپنی بے وقوفی کی داد چاہتی ہوں کہ میں مجبورِ محبت کی طرح دیوتائے عشق کے تیروں کا نشانہ بنی رہی۔

غرض وہ تینوں شیریں کلامی اور خوش بیانی سے ایک دوسرے کو محظوظ کرنے لگے۔ محسن اور شہزادی کی زندگی محبت کی میٹھی کہانی کی طرح دلپذیر ہو گئی عالم بے فکری میں صبح کی سیر شام کی تفریح اور پھر طالب و مطلوب کا قرب خوابِ زندگی کی کیسی دل خوش کن تعبیر ہے۔ ان کے تصور کی فضاؤں میں رنگ و نور برستا تھا۔ ان کا ایک لمحہ حیات بہشت میں لمبی زندگی کے برابر تھا۔

اصحابِ کہف کا قصّہ

اجنبی مہمان کو صحت کلّی ہو گئی۔ وہ ہوٹل کے باہر باغ میں خوش وقت ہو رہے تھے۔ اندرما نے دریافت کیا کہ اے اجنبی بزرگ آپ نے کہا تھا کہ مجھ پر اصحابِ کہف کا ماجرا گذرا ہے۔ اصحابِ کہف پر کیا ماجرا گذرا تھا۔ اجنبی بولا

"خدا ایک ہے اور اس کے سوا کوئی نفع و ضرر کا مالک نہیں۔ یہ عقیدہ گو بعض کے نزدیک سیدھا سادھا سہی۔ مگر ابتدائے آفرینش سے مابہ النزاع چلا آتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہدایت یافتہ لوگوں کے سوا عوام خدائے نادیدہ کے صحیح تصوّر سے قاصر ہیں۔ ان کی محدود عقل غیر محدود کائنات کے خالق کو سمجھنے سے عاجز رہتی ہے۔ اس لئے وہ ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں۔ اہلِ مکر و دجل عوام کی اس بدعقلی سے فائدہ اٹھا کر ان کو گمراہ کر کے لوٹتے ہیں۔

مدتِ مدید و عرصۂ بعید کا ذکر ہے کہ ایک قوم کائنات کے پروردگار کے علاوہ اور چیزوں کو اپنی عقیدت کا مرجع بنا بیٹھی، چند سعید فطرت نوجوانوں نے کہا اے قوم گمراہ نہ ہو۔ اللہ کے سوا کوئی پرستش اور پوجا کے قابل نہیں۔ اس کے سوا کسی کو اپنا حیلہ وسیلہ

نہ ٹھہراؤ۔ قوم نوجوانوں کی اس پکار سے بھڑک اٹھی اور درپے آزار ہوگئی۔ کہیں پناہ نہ پاکران نوجوانوں نے ایک غار میں عافیت ڈھونڈی۔ یہ نوجوان تعداد میں سات تھے۔ ان کے ہمراہ ایک کتا تھا جو غار کے دہانے پر چاک وچوبند بیٹھ گیا۔ خدا کے کھیل نیارے۔ ان پر نیند طاری ہوگئی اور صدیاں اسی حال میں گذر گئیں۔ قرنوں کے بعد وہ ایک دن بیدار ہوئے اور سمجھے کہ آج ہی سوئے تھے اور ابھی اُٹھے ہیں۔ مناسب ہے کہ ہم میں سے ایک بہ تبدیلِ لباس بستی میں جائے اور خورد ونوش کا سامان لے آئے۔ چنانچہ ان میں سے ایک گیا۔ لیکن اس کا سکّہ سکّۂ رائج الوقت سے مختلف تھا۔ سکّے اور اس کے سن پر بحث کا آغاز ہوگیا۔ لوگوں نے خیال کیا اس نے کہیں دفینہ گڑا پایا ہے، نوبت بادشاہ تک پہنچی۔ اصحابِ کہف میں سے اس شخص نے اپنا ماجرا بیان کیا۔ اس وقت کے لوگوں میں قیامت اور نشاۃ الثانیہ پر اختلاف تھا۔ بادشاہ خود متذبذب تھا۔ بادشاہ اور اس کی قوم نشان دہی کے مطابق اس غار میں گئی ہیبتناک غار اور پُر اسرار شخصیتوں نے ان کے قلب کو مومن کردیا۔ اور ساری قوم قیامت اور نشاۃ ثانیہ کی قائل ہوگئی۔

قرآنِ حکیم نے صرف اتنا اشارہ کیا ہے کہ ان پر یعنی اصحابِ کہف پر اللہ نے اپنی رحمت پھیلا دی۔ ان سے خرقِ عادت افعال کا سرزد ہونا تعجب کی کیا بات ہے۔ یقین ہے کہ قوم مذکور ان احوال سے متاثر ہو کر قیامت اور حشر و نشر پر ایمان لے آئی ہو۔ بیان کیا گیا ہے کہ اصحابِ مذکور اس قوم کو رخصت کر کے پھر سو گئے۔ اس واقعہ کے بعد نو سو سال گزرنے پر وہ پھر اُٹھے لیکن قرآنِ حکیم نے ان کے حال کے متعلق زیادہ جستجو سے پیغمبر کو بھی روک دیا۔ البتہ سرسری ذکر کی اجازت ہے۔

اجنبی نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مجھ پر بھی یہی حال گذرا ہے اور اس بزرگ نے میرے اس حال کی طرف اشارہ بھی کر دیا تھا۔

اندرما خوشی سے اچھل پڑی اور کہا کہ ایک طرف تمہاری الجھن دُور ہو گئی، دوسری طرف میری الجھن دُور ہو گئی میں کیوں تصوّر نہ کر لوں کہ جن بزرگوں کی ہمیں زیارت ہوئی ہے یہ وہی سات آقا ہیں جن کا ابنی لبسنت نے ذکر کیا۔ جو کبھی کبھی قوموں کی رہنمائی کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

اجنبی۔ سات اصحاب کا قصہ سب مذاہب میں مشترک معلوم ہوتا ہے

لیکن ایک بات یاد رکھنی چاہئے کہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم کہیں یہ سمجھ بیٹھیں کہ خدا کے منشا کے خلاف اپنی رائے اور طبیعت سے کوئی شخص کسی کے کام آسکتا ہے۔ بہتر اصولِ زندگی یہی ہے کہ انسان بیرونی امداد سے بے پرواہ ہو کر خدا کی مہربانی پر بھروسہ کر کے کام کی کامیابی کے لئے خود سعی کرے۔ وہ قومیں جو غائبانہ امداد کے بھروسے پر اُٹھتی ہیں اور خود اپنی مدد نہیں کرتیں۔ بالآخر ذلت اُٹھاتی ہیں۔ اندرما۔ معزز مہمان میں ان لوگوں میں سے نہیں جو پیروں فقیروں کے بھروسے پر عمرِ عزیز ضائع کر دیں۔ ہر نیک انسان کی قدرتی خواہش ہوتی ہے کہ دنیا میں بھلائی اور نیکی ترقّی کرے اور برائی کا استیصال ہو۔ جو نیک لوگ جس حال میں ہوں اگر وہ بنی نوعِ انسان کی خدمت اور اس کی ترقی کے خواہاں ہوں ہمیں خوشی ہونی چاہئے۔ اسی لئے میں سات آقاؤں کے تصوّر سے خوش ہوں کہ اُن سے ایسے افعال سرزد ہونے کی شہرت ہے جو بنی نوعِ انسان کی بھلائی اور بہتری میں ممد اور معاون ہیں۔ ورنہ کسی کا ذکر ہی فضول ہے

اتنے میں ہوائی جہاز کے سر پر اڑنے کی آواز آئی۔ اجنبی نے نگاہ

اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور تعجب سے پوچھا یہ کیا ہے۔

اندر ما نے کہا کہ یہ ہلاکت خیزی کے جدید آلات میں سے موثّر ترین چیز ہے۔ اس کو انسان اڑائے لئے پھرتے ہیں۔ گھنٹوں میں ملکوں ملکوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہوائی جہاز اس کا نام ہے بستیوں میں موت پھیلانا کام ہے۔

اجنبی نے کہا دُنیا کیا کچھ ترقّی کر گئی ہے۔ کیا اس کا بنانے والا مسلمان ہے۔

اندر ما۔ دُنیا نے ہوائی جہاز تیار کر لئے لیکن مسلمان کی ترقی اونٹوں پر سفر کرتی ہے۔

اجنبی پھر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر کہا کہ مسلمان زندگی بھر کیا کرتا ہے۔

اندر ما۔ ہندوستانی مسلمان زیادہ تر حقّہ پینے۔ پان کھانے میں مصروف رہتا ہے۔ اسے ان مشاغل سے فرصت ہی نہیں ہوتی کہ دنیا و دین کے کام کی طرف دھیان دے سکے۔ آپ کی قوم کے عالم اور جاہل سب انہی امراض میں مبتلا ہیں۔

حقّہ اور پان کیا ہوتا ہے۔ اجنبی نے کہا۔

اندر ما۔ ایک ٹوٹی کو آگ میں رکھ کر دھواں ایک نالی میں سے نکالکر

پیتے ہیں۔ یہ حقہ ہے۔ ایک قسم کے پتّوں پر مسالہ لگا کر کھاتے ہیں وہ پان ہے۔ پان کے تھوک سے دیواریں اور حقہ کی راکھ سے گھر کے فرش خراب رہتے ہیں۔ اور دم بھر دونوں یہ چیزیں نہ ملیں تو ان کی جان پر آفت آجاتی ہے۔

"تو کیا علما ان چیزوں کی ممانعت نہیں کرتے۔

شہزادی۔ علما کا بیشتر حصہ انہی بدعادات کا شکار ہے۔ جو خود گم ہے رہبری کیا کرے گا۔

محسن نے اس غم انگیز ذکر کو ڈاکٹر کی ہدایت کے خلاف سمجھ کر روک دیا لیکن اجنبی نے کہا آپ بے شک ہزار صدمہ کی بات کہیں میں اب ہرگز متاثر نہیں ہو سکتا۔ لیکن محسن نے جواباً کہا بات ہو چکی اس کو طول دینے سے کیا فائدہ۔

اجنبی نے اب ہندوستانی زبان سیکھنا شروع کر دی۔ کچھ نہ کچھ وہ پہلے بھی سمجھ سکتا تھا۔ تھوڑے سے عرصہ میں اُس نے اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی محسن نے ایک دن کہا کہ آپ ان ساحلوں پر چلکر یقیناً محظوظ ہونگے جہاں آپ پہلے پہل اترے تھے۔ یہاں گرمی کا موسم ہے۔ مناسب ہے کہ کراچی چل کر چندے آرام کریں۔ پھر آپ دوسرے حصۂ ملک میں سفر کر کے ہندوستان کے حالات سے

واقفیت بہم پہنچائیں۔

وہ دوسرے دن کراچی چل دیئے اور کئی دن ساحلی نظارہ سے محظوظ ہوتے رہے۔ کراچی کی ٹرام گاڑیوں، موٹروں اور عمدہ سڑکوں بلند مکانوں کو دیکھ کر اجنبی ابتدا میں ملکی خوشحالی کا قائل ہو گیا لیکن جلد ہی غریب طبقہ کی پر حسرت زندگی کو دیکھ کر تلملا اٹھا۔ اُس نے کہا بنی نوعِ انسان میں یہ اقتصادی تفاوت ناقابلِ برداشت ہے ذرائع ملک کی یہ غیر قدرتی تقسیم امن عامہ کو ایک دن خاکستر کر دے گی۔ اگر غربا کی زبانیں عارضی طور پر بند ہیں تو وہ کل کُھل جائیں گی۔ اس ملک میں غریب طبقہ کی حفاظت اور خاص امداد کی صورتیں کیوں پیدا نہیں کی جاتیں۔

اندرما۔ ہندوستانی غلام اور بے زبان ہیں ان کی مرضی انکا قانون نہیں۔

اجنبی۔ یہ تو تمہارے بس کا روگ ہے۔

اندرما۔ وہ کیسے؟

اجنبی۔ اگر بے بسی کا احساس عزم میں بدل جائے اور عزم عمل میں تبدیل ہو جائے تو مَیں نہیں سمجھتا کہ ۳۲ کروڑ افراد غلام کیونکر رہ سکتے ہیں۔ اگر طبیعت کو گراں نہ گزرے تو میں کہہ دوں کہ آپ لوگ غلامی پسند ہیں۔ غلامی گناہِ عظیم ہے جو قوموں کی صلاحیتوں

کو برباد کر کے اس کو حیوان سے بدتر بنا دیتی ہے۔ اس پر قانع ہو جانے والی قوم دنیا کی بدترین نسل ہے۔

اندرما۔ اب بارہ سو برس کے بعد آپ کی زندگی نے نئی کروٹ لی ہے۔ اب آپ کی ذمہ داریاں ہم سے کم نہیں۔ ملک کی مصیبتوں کا حل جو آپ بتائیں گے ہم اس پر عمل کرینگے۔

اجنبی۔ کیا ہندوستان کی مشکلات کے بارے میں آپ نے اس بزرگ سے سوال نہ کیا تھا۔

اندرما۔ ہم نے پوچھا تھا اُس نے آزادی کی راہ میں رکاوٹ مختلف الخیال لوگ بتائے تھے۔

اجنبی۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ اتحادِ خیال اتحادِ عمل پیدا کرتا ہے اختلافِ خیال سے ہی مختلف گروہ بنتے ہیں۔ جب ملک اور قوم مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جائے تو ان کی موت پر فتویٰ دینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اندرما۔ تو کیا آپ نے ہندوستان کی بہتری کے لئے ہندوستان میں رہ کر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اجنبی۔ میں پہلے بھی جانتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی غلامی اور آزادی ایشیا کی غلامی اور آزادی ہے۔ اگر ہندوستان

اور اسلامی ممالک ایک ہی طاقت کے غلام ہیں تو ہندوستان کی آزادی کے بغیر اسلامی ممالک کی آزادی امر موہوم ہے۔ اس لئے میری مومنانہ فراست اس امر کی مقتضی ہے کہ میں زندگی کے باقی ایّام اسی ملک کی آزادی کے حصول میں صرف کروں۔ ہندوستان آزاد ہوگا تو عرب اور فلسطین خود ہی آزاد ہو جائیں گے۔ مصر، ایران، ترکستان اور افغانستان کی طرف کوئی نظرِ بد سے دیکھنے والا نہ ہوگا۔

آزادیٔ ہند کی شیدا شہزادی نیلوفر اور اندرا بے حد خوش ہوئیں

ایک دن چاروں کشتی میں بیٹھ کر ساحلِ کراچی کے قریب ایک جزیرہ کی سیر کو گئے۔ پھر ملکی مسائل پر بحث چھڑ گئی۔ کیونکہ یہی موضوع رات دن ان کی توجہاتِ کو پوری طرح جذب رکھتا تھا۔ پھر گفتگو اس امر پر مرکوز ہوئی کہ سیاست کو مذہب سے کیا نسبت ہے

اجنبی نے کہا یہ دو چیزیں نہیں۔ دنیا میں سیاسی سربلندی مذہب کا مقصد ہے۔ غلامی مذہب کو غیروں کے حکم کا پابند کر دیتی ہے۔ اسلام میں روزہ نماز کتنے ضروری رکن ہیں۔ لیکن سیاسی ضرورت یعنی جہاد میں دونوں ساقط ہو جاتے ہیں۔ کوئی نماز پڑھے یا تلوار چلائے۔ میدان کارزار میں ذراسی غفلت قوموں کو تہ تیغ کرا دیتی ہے۔ اسی لئے حضور نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جنگ

میں متصل چار نمازیں رہ گئی تھیں۔ اکثر مسلمانوں کو جو جذبۂ مذہب سے سرشار تھے مسلسل جہاد کے باعث عمر بھر روزے رکھنے نصیب نہیں ہوئے۔ کیونکہ جہاد یعنی سیاسی برتری کو مذہب کی ضروری رسومات پر بہت بڑی فوقیت ہے۔ میدان کی موت وہ چیز ہے جس کی آرزو ایمان کی سلامتی کی سند ہے۔

اندرما۔ کیا اسلام میں عورت کے لئے جہاد کا حکم نہیں۔

اجنبی۔ یہ حکم دونوں کے لئے یکساں ہے۔ صرف مقدم و مؤخر کا فرق ہے۔ دونوں کے لئے تربیتِ عسکری ضروری ہے۔ معلوم نہیں کہ قوم پر کیا وقت آئے۔ جو مسلمان مرد اور عورت ملک اور قوم کے آڑے وقت کے لئے تیار نہیں اس کی قولی عبادت درخورِ اعتنا نہیں۔

اندرما۔ معزز مہمان یہ تو تم عجب بات کہتے ہو جن عورتوں نے عمر بھر دروازہ کی دہلیز نہ دیکھی ہو وہ ہتھیار سنبھال کر حملہ آوروں کے مقابلہ کی کیا تاب لائیں گی۔

اجنبی۔ میں تمہارے اشارے کو یہاں کے پردے کی بنا پر سمجھتا ہوں قرآن اپنے احکام کے لئے کسی قوم یا ملک کی غیر اسلامی رسومات کا پابند نہیں۔ اسلام نے جہاد کے لئے مرد اور عورت دونوں کو

تیار رہنے کا حکم دیا ہے۔ جو ایسا نہ کریگا وہ اپنی عافیت برباد کرے گا۔ اور اندرما اگر بقول تمہارے مسلمان عورت حملہ آور کا ہتھیار سنبھال کر مقابلہ نہ کرے گی تو اپنی عصمت کی حفاظت کیسے کرے گی۔ یہاں عصمت کی حفاظت کے لئے عورت کو پابند پردہ کیا جاتا ہے۔ یہ غیر اسلامی تصوّر ہے۔ ہمارے وقت عورتیں ہر وقت مسلح رہتی تھیں اور شریک جہاد تھیں۔ اکثر مرہم پٹی کا کام کرتی تھیں اور بعض اوقات انہیں مردوں کے دوش بدوش لڑنا بھی پڑتا تھا۔ کیونکہ جہاد کے احکامات عورت اور مرد پر یکساں طور سے حاوی ہیں۔

اندرما۔ معزز مہمان تم ہتھیار بند ہونا کہتے ہو۔ عورت کا کھلی ہوا میں نکل کر سیر کرنا بھی ہندوستان کے مسلمان کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ برقعہ پہنے بغیر چلنا معیوب ہے۔ روزن سے جھانکنا قیامت ہے۔

اجنبی۔ کیا یہاں کے علما عورتوں کی اس بدحالی پر قوم کو توجہ نہیں دلاتے۔

اندرما۔ بے اختیار ہنس دی اور کہا۔ یہاں کے علما جہاد کے ذکر سے کانپتے ہیں۔ عورتوں کو تنگ کوٹھڑیوں میں رکھنے پر اصرار

کرتے ہیں۔

اجنبی۔ کیا یہاں کی عورتیں اسلامی احکام کی روشنی میں خود اپنے عمل کا جائزہ نہیں لیتیں۔

اندرما۔ مَیں مذہب اسلام سے واقف نہیں لیکن اتنا جانتی ہُوں کہ مسلمان عورتیں دین و دنیا کے علوم سے بے بہرہ ہیں۔

اجنبی۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بحکمِ پیغمبر تحصیلِ علم مرد اور عورت دونوں پر یکساں فرض ہے۔

اندرما۔ ہو گا! (اندرما نے لاپرواہی سے کہا) یہاں تو علما کی بیویاں بہنیں، لڑکیاں اور پوتیاں بے علم محض ہیں۔ جو دو کتابیں پڑھ لے اس پر انگلیاں اُٹھتی ہیں۔

اجنبی۔ تو وہ نہ علم پڑھتی نہ جہاد کی تیاری کرتی ہیں۔

اندرما۔ معزز بزرگ تم بارہ سو سال پہلے کا سپنا اب بھی دیکھ رہے ہو ہندوؤں کو تم مدّت سے غلام کہو۔ لیکن مسلمان ان سے کم غلامی پر قانع نہیں۔ معاف کرنا تم عورتوں کی جہاد کی تیاری کو روتے ہو۔ مسلمان مردوں میں آزادی کی کوئی خواہش نہیں۔

اجنبی نے غصّہ سے کہا تو یوں کیوں نہیں کہتی کہ یہاں کوئی مسلمان نہیں۔

اندرما - میں یہ کیسے کہوں - میں مساجد کو مسلمانوں سے بھری دیکھتی ہوں - وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسلام کا نام لے کر لڑتے ہیں۔ وہ مقدس مذہب کے نام پر ہی عورت کو پابند رکھتے ہیں - سپاہیانہ کھیلیں چھوڑ معمولی علم پڑھانے کو برداشت نہیں کرتے۔

اجنبی کے ماتھے پر شکن پڑ گئے جس کے معنے اندرما نے یہ سمجھے کہ وہ مزید گفتگو کو برداشت نہیں کر سکتا۔

تھوڑی دیر کے بعد اجنبی نے شہزادی سے دریافت کیا کہ آپ کی مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ عالم کے متعلق کیا رائے ہے۔

شہزادی - وہ ہر ملک کی ہمسایہ قوم سے ہر شعبۂ زندگی میں پھسڈی ہیں۔

اجنبی - گویا اسلام کی منشا کے خلاف بسر اوقات کر رہے ہیں۔ چاہئے یہ تھا کہ وہ لوگوں کے لئے نیکی کا نمونہ ہوتے اور بنی نوع انسان کی خدمت میں پیش پیش ہوتے۔ اور دنیا ان کی بے لوث خدمت کو دیکھ کر ان کی عظمت کی قائل ہو جاتی۔

شہزادی - اس بات پر زیادہ اصرار مناسب نہیں مگر حقیقت حال یہی ہے کہ جس طرح خاندان کا ضعیف اور بیمار فرد دوسروں کی توجہ کا محتاج ہے اسی طرح ہر ملک کا مسلمان دوسروں کے رحم کا مستحق بنا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ بغیر بوئے کے فصل کاٹنا

چاہتا ہے۔

اس کے بعد شہزادی نے بات ٹالنے کیلئے خوشگوار موسم اور دلفریب سبزی کی طرف توجہ منعطف کرائی اور کہا ساحلِ بحر کی سیر بھی بڑی پُر لطف ہے۔ کیا مزے کی ہوا ہے۔ لہروں نے کیا سماں باندھ رکھا ہے۔

اندرما نے کہا انسان اسی طرح کشتیٔ حیات میں بیٹھا زمانے کے وسیع سمندر میں لطف اٹھاتا جاتا ہے۔ کیا جانے زمانے میں کب اور کیونکر طوفان پیدا ہو جو افراد کی کشتیٔ حیات اور اقوام کے متاعِ عافیت کے جہاز کو غرق کر دے اور کون جانتا ہے کہ عالم میں کیا انقلاب پیدا ہو کہ غالب مغلوب ہو جائیں اور ہندوستان جیسے ملک کی قسمت بھی خوشگوار پلٹا کھائے۔

اجنبی نے کہا۔ مَیں خوش ہوں کہ وطنِ عزیز کی آزادی کا خیال تم دو لڑکیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ دنیا میں سیاسی اقتصادی اور نسلی امتیازات کو مٹانے والا یا اس کی کوشش میں جان دینے والا شخص خدا کے حضور میں بہت ہی محبوب ہے۔

محسن خاموش تھا لیکن اس کی خاموشی پُرسکون سمندر کی طرح گہرے خیالات کا پتہ دیتی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ ایک وقت تھا کہ

مشرقِ اخلاقی اور سیاسی برتری کا مدعی تھا۔ اب مغرب کے اخلاق کا متبع اور اس کی سیاست کا غلام ہے۔ ایشیا کے اربابِ دانش اب اپنے ملک کی آزادی کے طلبگار ہیں۔ لیکن ان کی آرزوؤں کی تکمیل میں ہندوستان کی غلامی حائل ہے۔ اس اجنبی نے بڑے پتے کی بات کہی کہ اس ملک کی آزادی میں ہی دنیائے اسلام کی آزادی کا راز مضمر ہے۔ اس ملک سے دنیا کے آزاد ممالک کو غلام بنانے کا فتنہ کھڑا ہوا۔ یہاں کے وسیع ذرائع ایشیا اور افریقہ کی غلامی کے لئے استعمال کئے گئے۔ ایشیا اور ممالک اسلامیہ کی ترقی اور آزادی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ ہندوستان آزاد ہو۔ تعجب ہے کہ ملک ہند کا مسلمان اسلام کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہے لیکن ہندوستان کی آزادی میں راہنمائی نہیں کرتا۔ اور اتنی موٹی بات نہیں سمجھتا کہ ہندوستان کی آزادی پر ہی اس کی دعاؤں کی تکمیل کا انحصار ہے۔

محسن ان ہی خیالات میں مستغرق تھا۔ شہزادی اس کو گہری سوچ میں دیکھ کر کچھ پریشان سی ہوئی۔ اک ادا سے مسکرا کر شہزادی نے اس کی طرف دیکھا۔ محسن کو معلوم ہوا کہ سنگلاخ راستوں اور کالے پہاڑوں سے نکل کر وہ کشمیر کی خوشنما وادی میں آگیا ہے۔

گو سیاسیات کے خشک مباحث میں محسن اور شہزادی کو اپنی محبت کی میٹھی کہانی زبان پر لانے کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ عشقِ صادق بعض مراحل پر پہنچ کر گونگے کا گڑ کھا لیتا ہے اور آنکھیں اظہارِ مدعا کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ مسکراہٹ ہی اعترافِ عشق کا معصوم طریقہ ہے۔ شہزادی گاہے گاہے اپنے شیریں تبسّم سے تجدید محبت کرتی۔ محسن کے دل کی دنیا میں موسم بہار کا دور دورہ ہو جاتا۔ عشق کے رازداروں کے سوا حسن کے اس اعجاز سے کون واقف ہے کہ مردہ دل اک نگاہ ناز سے زندہ ہو جاتا ہے۔ شہزادی کا مسکرا کر دیکھنا تھا کہ محسن کے چہرے پر شگفتگی آگئی۔ سیر کا لطف دوبالا ہو گیا۔ سرو محبوبی اور مناظر کی خوبی جنہیں میسّر ہو وہ محسن کی طرح اپنی خوش بختی پر کیوں ناز نہ کریں محسن اب سیاسی افکار سے خالی الذہن تھا وہ کبھی محبوب اور کبھی منظر کو دیکھتا تھا۔

شہزادی کے لئے محسن کے چہرے کی شگفتگی اسکے اس پیغامِ محبت کا جواب تھی جو مسکراہٹ کے رنگین لفافہ میں بند کر کے ارسال ہوا تھا۔ عورت تو جھوٹے مرد کی جعلی سرد آہ سے بھی سچی محبت کا گمان کر کے مائلِ محبت ہو جاتی ہے۔ عشق صادق کے شیریں اشاروں سے تو بے پایاں خوشی محسوس کرتی ہے۔ غرض محبت کے تحفے دونوں طرف

ارسال ہوتے رہے اور وصول کئے جاتے رہے۔ سمندر کی جاں آفریں ہوائیں ان پر ایک نشہ سا طاری کر رہی تھیں۔ انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہشت کی رنگین وادیوں میں مصروفِ سیر ہیں اور حوریں ان کے گرد ہالہ بنا کر محوِ رقص ہیں۔ اور جب یہ نشہ اترنے لگتا پھر شہزادی اس کو دیکھ کر مسکرا دیتی۔ وہ کشتی میں بیٹھا پھر ازواجِ تبسّم میں بہنے لگتا۔

غرض وہ یوں سیر کا لطف اٹھاتے واپس آ گئے۔ کل جمعہ کا دن تھا۔ اندرما نے اجنبی کو کہا نمازِ جمعہ مسلمانوں کی تنظیم کی جان ہے لیکن افسوس اس سے بھی بہت کم فائدہ حاصل کیا جاتا ہے۔

اندرما اجنبی نے کہا میں نے دل میں فیصلہ کر لیا ہے کہ میں جمعہ کے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں گا۔

محسن نے اس تجویز کو مناسب نہ سمجھا اور کہا مجمع کی طبیعت کے برخلاف بات کہنا ہنگامہ برپا کرنا ہے۔ اجنبی نے جو زمانہ دیکھا ہے وہ حال سے مختلف ہے۔ اب ہمارا اسلام کفر اور شرک سے ملتا جلتا ہے۔ بے دینی کو مسلمان دین سمجھے بیٹھے ہیں۔ مجھے احتمال ہے کہ وہاں بدمزگی ہوگی۔

اندرما مسلمانوں کی شکایت بے جا نہیں۔ ہندوؤں کی تنگ نظری کچھ کم باعثِ ندامت نہیں۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا بدنصیب

نہیں جہاں کے اہلِ وطن ہمسایہ سے چھوت کریں۔ مسلمان کا طرزِ عمل تو ہندو کے سلوک کا ردِعمل ہے۔ میں جب محض مسلمان کی مذمت سنتی اور پڑھتی ہوں تو دل کانپ اُٹھتا ہے کہ ہندوستان کی اگر ایک قوم میں بھی صلاحیت ہوتی تو اہلِ ملک کی موجودہ حالت نہ ہوتی۔ باقی رہا بدمزگی کا سوال یہ بات تو ہر سچائی کے اظہار کے وقت ہونے کا احتمال ہے۔ ان احتمالات کی بنا پر زبان کو گنگ کر لینا دلیلِ دانائی نہیں۔

اجنبی۔ تمہاری رائے درست ہے اندرما۔ دعوتِ حق کے لئے تو ہر قسم کے خطرات برداشت کرنے ہوتے ہیں۔ کیا بہتر نہ ہو کل بعد از نماز جمعہ تم بھی جامع مسجد میں آجاؤ۔

اندرما۔ میں غیر مسلم مسجد میں کیسے آجاؤں۔

اجنبی۔ کیوں تمہیں کیا اعتراض ہے۔ اندرما

اندرما۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں مگر مسلمان ضرور اعتراض کرینگے۔

اجنبی۔ مسلمانوں کو اعتراض کا کیا موقعہ ہے۔

محسن۔ یہ آپ کی غلطی ہے۔ آپ پھر پرانے زمانے کے حالات کو اور موجودہ مسلمانوں کے تعصبات کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ بیشک قرونِ اولیٰ میں غیر مسلم کا مسجد میں آنا عام بات تھی۔ مگر اب ہندوستان

میں یہ صورت ناقابلِ برداشت ہے۔

اندر ما۔ بے شک واقعہ یہی ہے لیکن اس میں بھی مسلمان تنہا قصوروار نہیں۔ ہندوؤں کے معبد میں داخلہ پر تو سخت پابندیاں ہیں۔ اسی پر مسلمانوں نے بھی اپنے اصول کی بنا رکھ دی۔

اجنبی خاموش ہو گیا۔

جمعہ کی صبح سعید طلوع ہوئی۔ اجنبی نے حسبِ معمول نماز کے اہتمام میں غسل کر کے لباس بدلا، خوشبو لگائی، آنکھوں میں سرمہ ڈالا اور محسن کو ساتھ لے کر اول صف میں جا بیٹھا۔ امام نے عربی میں خطبہ پڑھا۔ نمازیوں نے ایک حرف نہ سمجھا مگر اجنبی جھوم جھوم گیا جماعت سے فارغ ہو کر اجنبی نے عربی لہجہ میں ہندوستانی بولنا شروع کی کہ میں حالاتِ حاضرہ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اس کی آواز میں وقار تھا اور عظمت اس لئے لوگ نماز سے فارغ ہو کر ٹھہر گئے۔ اجنبی نے سب کو مخاطب کر کے کہا۔

میرے دینی بھائیو! اسلام مساوات کا علمبردار ہے وہ نسلی اقتصادی اور سیاسی تفاوت کو برداشت نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ مسلمان اچھے طریقہ سے ان امتیازات کو دور کریں۔ اسلام میں ذات پات نہیں۔ جو بہتر عمل کرے وہی خدا کا محبوب ہے۔ خاندان

اور نسل میں کوئی شرافت اور رذالت نہیں۔ انسان سب برابر ہیں ان کے عمل میں شرافت اور رذالت ہے۔"

سامعین میں ایک شخص اُٹھا اور اُس نے جھٹ سوال کیا کہ کیا سیّد اور امتی برابر ہوتے ہیں؟"

اجنبی۔ ہم تو اپنے وقت میں صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سیّد تصوّر کرتے تھے۔ ان کے علاوہ سب مسلمان برابر کے بھائی ہیں۔ ایک دوسرے پر صرف عمل سے فوقیت ہے۔

سوال کرنے والے نے پکار کر کہا کہ مسلمانو! یہ کوئی نجدی ہے سادات کو امتیوں کے برابر بتاتا ہے۔ اس شخص کا یہ کہنا تھا کہ مخلص جاہل اس پر ٹوٹ پڑے۔

محسن نے خطرے کو محسوس کر کے پکار کر کہا یارو! یہ کوئی دیوانہ ہے۔ اس آواز پر کئی اور آوازیں آئیں کہ دیوانے کو نہ مارو۔

ان آوازوں کا اثر یہ ہوا کہ ہاتھ فوراً رک گئے۔ تاہم اجنبی کی تھوڑی سی تواضع ہو گئی اور بہت سا تجربہ حاصل ہو گیا۔

اجنبی سارا راستہ حیران تھا کہ کس عذر پر حملہ ہوا۔ اسے بتایا گیا اولاد فاطمہ کو سادات کہتے ہیں اور وہ اس علاقہ میں عام مسلمانوں سے بہرحال بہتر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں عمل کی خوبی شرط نہیں۔

یہ کتنا غیر اسلامی تصور ہے۔ اجنبی نے کہا۔

محسن نے جواب دیا مگر آپ مدّت تک عام مسلمانوں کو مساوات کا قائل نہ کر سکیں گے۔ جان بچ گئی۔ یہی غنیمت جانیے۔

اجنبی۔ اور خاص مسلمانوں کا کیا حال ہے۔

محسن۔ وہ بے شک مساوات اسلامی کے قائل ہیں اور نسلی امتیازات کو روا نہیں رکھتے۔ جوں جوں تعلیم عام ہو رہی ہے مسلمان پھر نسلی اقتصادی اور سیاسی امتیازات کے کھلے مخالف ہو رہے ہیں لیکن جاہل کو عالم بنانے کے لئے ایک مدّت چاہئے۔

اجنبی۔ الحمدللہ یہ بہت بڑی خوشخبری ہے

وہ یوں باتیں کرتے ہوٹل میں پہنچے۔ شہزادی اور اندرما ہوٹل کے بیرونی دروازے پر متوحش کھڑی تھیں۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ان کو آتے دیکھ کر وہ دوڑتی آگے بڑھیں اور پُوچھنے لگیں کہ خیریت تو رہی۔

قبل اس کے کہ وہ جواب دیں۔ انہیں حیرت ہوئی کہ انہیں مسجد کے خطرے کا علم کیسے ہوا۔ اس لئے محسن نے مختصر طور پر قصہ بیان کر کے اندرما اور شہزادی سے پُوچھا آپ کو ہمارے آنے سے قبل خطرے کا علم کیسے ہوا۔ کہ آپ متوحش سی ہوئی کھڑی تھیں۔

اندرمانے کہا کہ ہم برآمدے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ یکبیک اسی بزرگ کی آواز سنائی دی - وہ کہہ رہا تھا کہ اجنبی پر حملہ ہوگیا۔ مگر بچ گیا - ایسا ہی حادثہ دہلی میں پندرہ دن کے اندر پیش آئیگا اس سے جان بر نہ ہو سکے گا" اس وقت سے فکرمند ہو کر ہم یہاں کھڑی آپ کا راستہ دیکھ رہی تھیں -

چلو آؤ - اجنبی نے مسکرا کر کہا - موت پر فکرمند ہونا نہ صرف شایانِ شان نہیں - بلکہ اس کی تمنا کرتے رہنا ہی ایمان کی دلیل ہے -

محسن نے کہا کہ یہ اس بزرگ کی کتنی بڑی کرامت ہے کہ خود کہاں ہوگا اور کہاں سے یہ اطلاع دی ہوگی -

اجنبی - اگر آپ آلات کے ذریعہ سے ہزاروں میل کے فاصلہ سے گفتگو کر لیتے ہیں تو کسی دور بیٹھے شخص کی آواز سُن لینا بہر حال تعجب کی بات نہیں - خرقِ عادت افعال تو فاسق و فاجر سے بھی سرزد ہوتے ہیں - اس لئے محض کشف و کرامت ہمارے زمانہ میں درخور اعتنا نہیں تھے - البتہ وہ شخص قابلِ عزت تھا جس کی ذات سے بنی نوعِ انسان کو زیادہ فائدہ پہنچتا تھا - اور جو دوسروں کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈال دیتا تھا اور اپنے عمل کا اشتہار نہ دیتا تھا -

چاروں ہوٹل کے برآمدے میں بیٹھ گئے۔ شہزادی نے کہا۔ معلوم نہیں کہ مسلمانوں میں نسلی اور نسبی فوقیت کا فتنہ کہاں سے پیدا ہو گیا۔

اجنبی۔ خلفائے راشدین کے بعد معاویہ کے خاندان کی ملوکیت پسندی اور اس کے جواب میں فاطمیوں کی نسب پسندی اس کے ذمہ وار ہیں۔ ہمارے وقت میں یہ بیماری عوام تک نہ پہنچی تھی فخر و غرور کے اس سامان پر لڑائی صرف ان دو خاندانوں تک محدود تھی۔ اب دیکھتا ہوں یہاں کے مسلمان مذہب کی بنا پر تقسیم ہیں شاید اور اسلامی ممالک کا بھی یہی حال ہو۔

شہزادی۔ نہیں یہ مرض اس جگہ زوروں پر ہے اور ممالک میں نہیں۔

اجنبی۔ اس پر بھی خدا کا شکر کرنا چاہئے مگر یہاں ایسا کیوں ہے۔

اندرما۔ یہاں کی اکثریت کا مذہب نسل اور نسب کو تسلیم کرتا تھا مسلمانوں نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی براہمنوں کے مقابلہ میں سادات کا درجہ بڑھایا۔

شہزادی نے کہا کہ ہمارے معزز مہمان کے متعلق سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جو نسلی اقتصادی اور سیاسی امتیازات کو مٹانے کا عزم لے کر ہندوستان میں آیا تھا اس کی بات آج اسکی

اپنی قوم نہ صرف سننے کے لئے تیار نہیں بلکہ ان غیر اسلامی امتیازات کو اسلامی سمجھ کر برقرار رکھنے پر مصر ہے۔

دوسرے دن بمبئی بذریعہ جہاز روانہ ہوئے۔ اجنبی بادبانی جہازوں کے مقابلہ میں موجودہ جہازوں کے سازوسامان کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جہاز سمندر کا سینہ چیرتا ہوا حیرت انگیز تیزی سے جا رہا تھا۔ اور وہ متعجب تھا جب وہ ساحلِ بمبئی پر پہنچے تو وہاں کی سج دھج دیکھ کر وہ اور بھی محظوظ ہوا۔ اس نے خیال کیا کہ دنیا کیا کچھ ترقی کر چکی ہے مگر اس ترقی میں مسلمان کا کیا درجہ ہے وہ مایوس ہو جاتا تھا۔ پھر وہ سوچتا تھا کہ میں ہر معاملہ کو اسلامی رنگ میں کیوں دیکھتا ہوں۔ اگر نام نہاد مسلمان ترقی نہیں کرتا تو کوئی وجہ نہیں کہ خدا کی مخلوق کی ترقی اس کی وجہ سے رکی رہے۔

وہ چار دن بمبئی اور اس کے مضافات میں مصروف سیر رہے اور پھر مدراس چلے گئے۔ وہاں چار روز رہ کر کلکتہ روانہ ہوئے۔ وہاں پانچ روز تک سیر کرتے رہے۔ اجنبی ہر مقام پر مسلمانوں کی حالت کا بڑی دلچسپی سے جائزہ لیتا تھا۔ تعجب کرتا تھا کہ ہمہ گیر افلاس نے ان کا کیا حال کر رکھا ہے مصیبت کی ایسی حالت کے باوجود انہیں پھر بھی اپنی حالت بدلنے کا احساس نہیں اور وہ بدستور

جاں بخش تحریکوں سے دور رہتے ہیں۔

کلکتہ اور مضافات کلکتہ کی سیر سے جی بھر گیا تو اجنبی نے دہلی کی سیر کا ارادہ ظاہر کیا۔ اندرما اور شہزادی کا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں اسے موت تو دہلی میں بلا نہیں رہی۔ وہ دھلی کے سفر پر آمادہ نہ ہوئیں۔ اجنبی بھی بھانپ گیا کہ وہ میری موت کے ڈر سے کانپ رہی ہیں۔ اسے موت کے خوف سے نفرت تھی وہ جھنجھلا گیا اور کہا موت سے جان بچانے والی قوم دنیا میں ذلیل رہتی ہے۔ بہت اچھا آپ دہلی میں نہیں جانا چاہتیں تو لکھنؤ چلیں۔ چنانچہ لکھنؤ چل دیئے۔ وہاں کی سیر سے فارغ ہو کر اجنبی نے کہا کہ اگر تم میری موت سے ہی ڈرتی ہو تو یہ بھی یاد رکھو کہ میری موت تو شاہی مسجد میں ہی بیان کی ہے میں شاہی مسجد میں نہ جاؤں گا۔ دہلی جانے میں کیا قباحت ہے۔

شہزادی نیلوفر نے محسوس کیا کہ انسان اسی طرح تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر موت کے منہ میں جاتا ہے۔ وہ دہلی جانے پر رضامند نہ ہوئی۔ اجنبی نے پھر سب کو ملامت کی کہ موت سے یہ خوف میرے ایمان کو ضائع کر دے گا۔ میں تو ضرور دھلی جاؤنگا البتہ تم اصرار کرو گے تو شاہی مسجد میں نہ جاؤں گا۔ ایسی احتیاطیں جو تم کرنا چاہتی ہو تا مناسب

ہیں۔ محسن نے اس بزرگ کے انتباہ کو کچھ زیادہ وقعت نہ دی تھی۔ وہ اجنبی کے دہلی جانے میں کوئی زیادہ ہرج نہ سمجھتا تھا۔ البتہ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ اجنبی خواہی نخواہی مسجد شاہی میں جا کر کسی اور جھگڑے میں الجھے۔ کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ اجنبی کا جذبہ تبلیغ ان دنوں زوروں پر ہے۔ مبادا وہ کراچی جیسے ناخوشگوار واقعہ کے تکرار کا باعث ہو۔

غرض اجنبی کے اصرار اور محسن کی لاپرواہی نے شہزادی اور اندرما کو دہلی آنے پر مجبور کر دیا۔ دہلی کے آثار صنادید سے اجنبی کی آنکھوں میں بے ثباتی عالم کا نقشہ کھنچ گیا۔ فلک نے کن کن ناموں کے نام مٹا دیئے۔ بڑی بڑی عمارتیں گذشتہ عظمت کی نوحہ خواں اور گرا رہ گئیں۔

شہزادی نے ایک دن کہا اندرما مجھے اس اجنبی کے متعلق بار بار ایک شہرہ آفاق حکایت یاد آتی ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت ایک شخص دار السلطنت میں ہنسی خوشی بازار کی سیر کرتا پھر رہا تھا کہ اُس نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ سیر کرنے والے پر ایسا خوف و ہراس طاری ہوا کہ اُس نے سلیمانی تخت کا پایہ تھام کر حضرت

سلیمان سے استدعا کی کہ یہاں جان کا خوف ہے۔ مجھے ملک چین میں پہنچا دیا جائے۔ حضرت سلیمان اس کے اضطراب اور بیقراری سے بہت متاثر ہوئے۔ اور تختِ سلیمانی پر بٹھا کر اسے ملک چین میں پہنچا دیا گیا۔ اتنے میں فرشتہ اجل حضرت سلیمان کی خدمت میں حاضر ہوا کہ آپ نے میری ایک بڑی مشکل حل کر دی ہے یہ شخص جس کو آپ نے چین پہنچایا ہے۔ کل کے دن اسکی موت چین میں مقدّر تھی۔ مَیں حیران تھا کہ یہ شخص ہزاروں کوس دُور اس جگہ مقیم ہے یہ کل تک چین کیسے پہنچے گا۔ میں بازار میں آتے پھرتے بار بار دیکھتا تھا۔ یہ شخص میرے دیکھنے سے ایسا مرعُوب ہوا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر تختِ سلیمانی کا طالب ہوا تاکہ ملکِ چین میں پناہ پائے۔ حالانکہ وہی جگہ اس کی موت کا مقام ہے میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپنے میرے کام میں امداد فرمائی ہے۔

یہ حکایت بیان کر کے شہزادی نے کہا اندر ما معلوم ہوتا ہے کہ فرشتۂ اجل ہمارا شکریہ ادا کرنے کے لئے جلد آنے والا ہے۔ ہم اجنبی کو دہلی میں لے آئے ہیں۔ خدا کرے اس کی موت کا دن دور ہو۔ ورنہ کم از کم محسن نے تو فرشتۂ اجل کے کام میں امداد کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اور ہم دونوں بھی کم و بیش ممد و معاون ثابت ہوئی ہیں۔

آج جمعہ کا دن ہے مسلمان گروہ در گروہ شاہی مسجد کو جا رہے ہیں محسن اور اجنبی دونوں نماز کے لئے گھر سے نکلے۔ اجنبی مسلمانوں کے شوقِ نماز سے محظوظ تھا لیکن سوچتا تھا۔ اللہ کے ساتھ وابستہ مسلمان دنیا میں یوں غلام اور خوار ہوں۔ لوگ ہماری موجودہ حالت کو دیکھ کر ضرور اسلام سے متنفر ہونگے۔ یُوں معلوم ہوتا ہے کہ عزت کے کاموں میں ہمارا شایانِ شان حصہ نہیں۔ حالانکہ بروئے قرآن ہمیں دنیا کی اقوام کے قدرتی رہنما بننا چاہیئے تھا۔ خدمتِ خلق میں ہمارا انہماک سب سے زیادہ ہونا چاہیئے۔ علم کی اشاعت میں ہماری مساعی سب سے قابلِ قدر سمجھی جانی چاہیئے تھی۔ رفاہِ عام کے ادارے ہمارے ساتھ وابستہ ہونے چاہیئے تھے۔ ملک کی آزادی حاصل کرنے اور اقتصادی بدحالی دور کرنے کیلئے ہماری قربانی عدیم النظیر ہوتی تو سرخروئی تھی۔ میرے لئے دنیا میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ذلیل قوم کا فرد ہو کر زندہ رہنا کوئی زندگی نہیں۔ ہندوستان میں رہوں اور غلام مسلمان کہلاؤں کیسی شرم کی بات ہے۔

لیکن اسی زندگی کا دوسرا پہلو کیسا روشن ہے۔ وہ شخص کیسا خوش نصیب ہے جو قوم کی ذلت کو محسوس کر کے بے قرار زندگی بسر کرے اور قوم کو فلاکت کے گڑھے سے نکال کر اوجِ ترقی پر

پہنچا دے یا اس سعی میں جان دیدے۔ اس لئے مجھے مایوس ہونے کی بجائے ہندوستان کی جملہ اقوام کی رہنمائی میں باقی عمر بسر کرنا چاہیئے اور مسلمانوں کو اس امر پر آمادہ کرنا چاہیئے کہ وہ غفلت کو چھوڑ کر نئے عزم سے اُٹھیں۔ بنی نوع انسان کی خدمت میں سب سے سبقت لے جائیں۔ ملک کی آزادی کی تحریک میں سب سے پیش پیش ہوں۔ اہلِ وطن کی ایسی بے غرض خدمت کریں کہ وہ ہماری عظمت کے قائل ہو جائیں۔ یہی تمام مسلمانوں کا نصب العین ہونا چاہیئے۔

اجنبی انہی خیالات میں مستغرق تھا کہ ایک شخص منادی کرتا ہؤا سنائی دیا کہ بعد نماز جمعہ شاہی مسجد میں مسلمان اور تحریک آزادی کے مضمون پر لیکچر ہوگا۔ تمام مسلمان بھائی نہایت توجہ سے سنیں۔ ہرچند محسن نے کوشش کی کہ اجنبی شاہی مسجد کی بجائے کسی اور مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کر کے گھر لوٹے۔ لیکن وہ شاہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے اور تقریر سننے پر مصر تھا۔ محسن نے آخر رضامندی دیدی اور کہا کہ دیکھنا کسی نئی مصیبت میں نہ الجھنا۔

اجنبی پر نماز سنت میں عجیب رقت طاری تھی خدا کی عظمت وجلال کا نقشہ سامنے تھا۔ خطبہ کے بعد جماعت کھڑی ہوئی صفیں

اتحاد ممکن نہیں۔ باقی رہا آزادی کا معاملہ تو مسلمان بالفطرت آزاد ہے ملک خدا کا ہے جسے چاہے گا دیگا۔ انسان کے کئے سے کیا ہوتا ہے

کسی نے کہا مولانا آپ پیٹ کے لئے تو خوب تگ و دو کرتے ہیں اور بالفطرت آزاد مسلمان کو غلامی پر قانع رہ کر بسر اوقات کا مشورہ دیتے ہیں۔

اس پر مجمع میں شور ہو گیا قسم قسم کے آوازے سنے گئے اور بھانت بھانت کی بولیاں بولی جانے لگیں۔ کسی نے آواز دی ٹوڈی بچہ ہے منبر سے اتار دو۔ کسی نے ٹانگ پکڑ کر مولوی صاحب کو منبر سے گھسیٹ لیا۔ اس پر ہنگامہ ہو گیا۔ اب کیا تھا لے تیرے کی دے تیرے کی شروع تھی۔ اجنبی کو کیا جانے کیا سوجھی کہ اچک کر منبر پر جا کھڑا ہوا۔ اور تلاوت قرآن شروع کر دی۔ قرآن پاک کے احترام میں مجمع یک دم خاموش ہو گیا۔ اجنبی نے اس جوش و سرمستی سے قرآن پڑھا کہ مجمع جھوم گیا۔ ایک رکوع پڑھ کے کہا۔

اے فرزندان توحید! غلامی پر قناعت حقیقت اسلام سے بے خبری ہے۔ اگر مسلمان بالفطرت آزاد ہے تو ہندوستان کی سو سال کی غلامی میں اس کا آزاد نہ ہونا اسکے دعوٰی آزادی کی بہتر دلیل نہیں میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندو مسلمان کی مشترکہ جدو جہد کے بغیر ہندوستان

سیدھی ہونے لگیں۔ اس وقت اس کا دل خاص کیفیتوں کا حامل تھا۔ مسلمانوں کی بدحالی کا غم اس کی طبیعت میں نہ تھا۔ کیونکہ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ زندگی میں مقدور بھر کوشش کریگا کہ قوم کو قعرِ مذلت سے نکال کر بام ترقی پر پہنچا دے۔ اپنی اور مسلمانوں کی سعی کی بنیاد مخالفانہ جذبہ پر نہ رکھے بلکہ خدمت اور قربانی کی اساس پر قوم کے عمل کی عمارت استوار کرے۔ تاکہ دنیا پکار اُٹھے کہ مسلمان وطن کا بہترین فرزند ہے۔ اور بنی نوعِ انسان کا سب سے زیادہ خدمتگذار ہے۔

جب سب نماز سے فارغ ہوئے تو ایک منحنی سبز پوش بزرگ پان چباتے بڑھے اور لکڑی کے منبر پر چیختی آواز میں السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ طوطا شاخِ کہنہ پر اڑ کر چیختا چلاتا بیٹھ گیا ہے۔ اس نے قرآن پاک تلاوت کرکے اپنی طرف سے بعید از کار تفسیر شروع کی کہ دنیا میں اصلاح کے بعد فساد پھیلاتے نہ پھرو۔ ہندوستان میں بعض شوریدہ سر مسلمان ہندوؤں سے مل کر ہندوستان کی آزادی کے خواہاں ہیں۔ ان کی بیخ کنی ہمارا فرض ہے۔ کیونکہ کافروں سے ہمارا اتحاد نہیں ہوسکتا۔ انگریز پھر بھی اہلِ کتاب ہیں وہ ہندو سے ہمیں قریب ہیں۔ قریبی سے نفاق اور مشرک سے

کی آزادی کی کوئی صورت نہیں۔ شہنشاہیت پسند کبھی ہندو کو ساتھ ملا کر مسلمان کا سر کچلیں گے۔ کبھی مسلمان امپیریل ازم کے معاون بن کر ہندو کا کچومر نکالیں گے۔ مذہب میں ہندو مسلمان کو بیشک جدا رہنا چاہئے۔ لیکن ملکی مفاد کے لئے بحیثیت اہل وطن مل کر جدوجہد کرنا چاہیئے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو ساتھ لے کر دشمنوں سے جنگ کی۔ ہمیں بھی اسی اصول کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ مذہب کے مخصوص اعتقادات و اعمال میں ہم اوروں سے الگ رہیں۔ لیکن مشترکہ مفاد کے لئے ہم مل جل کر قربانیاں دیں۔

میں نے حال میں سنا ہے کہ بعض لوگ مذہب سے اظہار بیزاری کرتے ہیں۔ حالانکہ سچا مذہب ایثار قربانی اور خدمت کا درس دیتا ہے۔ ایسے مذہب کی اشاعت ملکی نجات کا ذریعہ ہے وہ مذہب جو علیحدگی کا حامی ہو اور فتنوں کی پرورش کرے بیشک قابلِ مذمت ہے لیکن جو نوجوان میں جوشِ جہاد پیدا کرے اور آزادی کے حصول کے لئے جان پر کھیل جانے کی دعوت دے مستحقِ عزت ہے۔ پس اپنے مذہب کو اپنے عمل سے سچا ثابت کرو لوگ مذہب کے گرویدہ ہو جائیں گے۔

ایک آواز۔ ایک سوشلسٹوں کا فرقہ پیدا ہو گیا ہے جو مذہب سے

بیزار اور خدا سے باغی ہے۔

باقی رہی خدا سے بغاوت۔ وہ صرف سوشلسٹوں پر کیا موقوف ہے سرمایہ دار بھی اس کا بڑا باغی ہے۔ غریب زبان سے بغاوت کرتا ہے اور امیر عمل سے بغاوت کرتا ہے۔ وہ دکھا ہوا کوئی بات کہتا ہے یہ آرام اور عیش میں خدا کو دعوت مقابلہ دیتا ہے۔ بہرحال خدائے اسلام کو ان بغاوتوں کا کوئی ڈر نہیں۔ وہ خود سرمایہ داری کے نظام کے خلاف ہے۔ اس کی خدائی میں سود حرام ہے اور سرمایہ داری پہ بھاری ٹیکس لگانے کا حکم ہے۔ اور جہاں سرمایہ زیادہ جمع ہو وہاں لوگوں کے نمائندہ حاکم کو ایسا سرمایہ قوم کے حق میں ضبط کر لینے کی اجازت ہے۔ ایسے غریب نواز خدا کے خلاف مزدور اور کسان کیوں بغاوت کرنے لگے۔

ہاں عزیز بھائیو! مذہب کی بحثوں کو مذہبی اداروں تک محدود رکھو لیکن ملک کی آزادی میں مل جل کر حصہ لو اور اہل وطن سے کوئی خطا بھی ہو جائے تو بہادر بھائی کی طرح درگذر کرو۔ تنگدلی مسلمان کا شیوہ نہ ہونا چاہیئے۔ خود امن اور اتحاد کے علمبردار بنو۔ ہر موقعہ پہ صلح کے لئے ہاتھ بڑھاؤ۔

اگر فرشتے بھی ہم پر حکومت کرنا چاہیں تو بھی ہمیں ان کی

غلامی سے انکار کرنا چاہیئے۔ غلامی پر قناعت سے بہتر یہ ہے کہ باہمی طور پر متحد ہو کر آزادی حاصل کریں۔ ہندو مسلم اتحاد کے سوا مجھے ہندوستان کی آزادی کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ یاد رکھو غلامی لعنت ......

ایک آواز۔ مسلمانو! یہ کوئی ہندوؤں کا اجیر ہے۔ توحید کا پیوند شرک سے لگانا چاہتا ہے۔

ٹھیک ہے۔ غلط ہے کی آوازوں سے محشر بپا ہو گیا۔

اجنبی نے دل میں کہا کہ میں نے تو اشتعال انگیز کوئی بات نہیں کہی۔ ہندوستانی مسلمان بھی عجیب ہیں۔ پہلے واعظ کو ٹوڈی بچہ کہا۔ پھر مجھے اجیر کا خطاب دیا۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے اُسے ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ اسکے سر پر ایسی چوٹ آئی کہ وہ گرتے ہی بیہوش ہو گیا۔ اور عالم بے ہوشی میں بار بار یہی کہتا تھا۔

"غلامی لعنت ہے اور افلاس کے خلاف جنگ انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ مسلمان کا یہ فرض ہے کہ خدمت اور ایثار کی بنا پر قوموں کی راہنمائی کرے۔"

آج شہزادی کی بائیں آنکھ بار بار پھڑکتی تھی۔ خدا خیر کرے اجنبی اور محسن سلامت لوٹ آئیں۔ اندرما بھی کچھ مغموم سی بیٹھی تھی یک بیک بجلی کے بلب سے ایک شور سا اٹھا اور ایک گونجتی آواز نے کہا۔ "اجنبی چل بسا" اس آواز کے ساتھ بلب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر گیا۔

"اجنبی چل بسا؟" اندرما اور شہزادی نے گھبرا کر کہا۔ ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اس آواز کو جھٹلا نہ سکتی تھیں۔ کیونکہ یہ وہی معروف آواز تھی جس نے پہلے کراچی میں خطرے سے آگاہ کیا تھا۔

وہ دونوں شاہی مسجد کی طرف تانگہ پر سوار ہو کر حواس باختہ چلیں۔ کیونکہ پہلی خبر میں شاہی مسجد ہی خطرے کا مقام بتایا گیا تھا وہاں پہنچ کر خلقت کا اژدہام دیکھا۔ مسلمان اہلِ کوفہ کی طرح اپنے فعل پر نادم تھے۔ کیونکہ ان کے ہاتھ سے اجنبی مارا گیا تھا۔ خون سے لت پت لاش صحن میں پڑی تھی۔ لاش کو چارپائی پر ڈال کر باہر لایا گیا۔ مشہور یہ ہو گیا کہ اجنبی کو اختلاجِ قلب کی شکایت تھی۔ حرکتِ قلب بند ہو کر گر گیا۔ اور فوت ہوا ہے۔ وہ شام تک تجہیز و تکفین سے فارغ ہو گئے۔ دو تین دن تینوں محسنؔ اندرما اور

شہزادی کی طبیعت اداس رہی۔

نمازِ مغرب کے بعد تینوں مکان کے باہر صحنِ چمن میں کرسیاں بچھائے بیٹھے تھے۔ ہوائیں اعتدال اور موسم خوشگوار تھا۔ اچانک وہی بزرگ پھلواڑی میں سے گزرتا ہوا ان کی جانب آتا دکھائی دیا۔ قریب آکر اُس نے السلام علیکم کہا پھر سب سے مخاطب ہو کر کہا "عزیزو میرے ساتھ آؤ۔ تمہیں ایشیا کے بہی خواہ لوگوں کی زیارت کراؤں۔ تاکہ ان کے افکار سے آگاہ ہو کر زندگی کو ملک کے لئے مفید بنا سکو۔"

وہ تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور خاموشی سے ساتھ ہو لئے۔ چند قدم چل کر بزرگ نے کہا آنکھیں بند کر کے بے خطر بڑھتے چلے آؤ۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے دو قدم اُٹھاتے ہونگے کہ آواز آئی آنکھیں کھول دو۔ جب آنکھیں کھول دیں تو انہوں نے اپنے آپ کو ایسی حسین وادی میں پایا جہاں صبح طلوع ہو رہی تھی۔ رنگین پہاڑوں پر حسن برس رہا تھا۔ زمین پر ہری ہری سبزے کی بانات بچھی تھی۔ فضا میں شاعری مہکتی تھی۔ ہوائیں بھی خوشبوئیں بکھیر رہی تھیں۔ شبنم کے موتی پھول کی پتیوں پر عارضِ محبوب کے ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کی طرح نظر آتے تھے۔ گلوں سے بلبلیں شوق سے باتیں کر رہی تھیں

شاخ در شاخ درخت ہوا سے جھوم جاتے تھے پھولوں کی خوشنما شاخیں خوبصورت نہر کے شفاف رواں دواں پانی پر جھکی ہوئی آئینہ میں عکس دیکھتی تھیں۔ بادِ صبا مولسریوں کے سایہ میں خراماں خراماں چل رہی تھی۔ پانی کے خوبصورت حوضوں پر فوارے چھُوٹ رہے تھے۔ سرو اس کے گرد شان سے کھڑے نظر آرا منظر کو دیکھ کر باغ باغ ہو رہے تھے۔ سامنے سنگ سفید کی ایک خوبصورت عمارت نظر افروز تھی جس کے سامنے تاج محل کا رنگ میلا تھا۔ اس کے در و دیوار پر لعل و جواہر جڑے تھے صحن میں زربفت کا سائبان نصب تھا۔ جس کے نیچے آرام دہ صوفوں پر متعدد بزرگ سفید لباس میں بیٹھے تھے۔ درمیان میں ایک مرصع تخت بچھا تھا۔ جب اس بزرگ کی معیت میں یہ تینوں پہنچے تو سب لوگ عزت و احترام سے کھڑے ہو گئے۔ ان تینوں کو خالی صوفوں پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ بزرگ بلا تکلف بڑھ کر اس مرصع تخت پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے مقام پر بیٹھ گئے۔

اس بزرگ نے بغیر ایک منٹ ضائع کئے مصطفےٰ کامل مصری کہہ کر آواز دی۔ جھٹ ایک نوجوان اٹھا اُس نے اس بزرگ کو مخاطب کر کے کہا کہ ہم سب اس امر پر متفق ہیں کہ ایشیا کی قوموں کی

ساری توجہ ہندوستان کی آزادی پر مرکوز ہو۔ ہندوستان کے چالیس کروڑ غلام کسی قوم کے تابع فرمان ہو کر سارے ایشیا کی آزادی کے لئے خطرہ ہیں۔ ایشیائی ممالک کی نجات اسی میں ہے کہ ہندوستان جلد از جلد غلامی سے نجات حاصل کرے۔"

بزرگ نے "حکیم اجمل خاں" کہہ کر آواز دی۔

ایک معمّر ہندوستانی اُٹھا اُس نے کہا کہ ہماری اس آرزو میں ایک جاپان کی حرص حائل ہے اور دوسرے ہندوستانی مسلمان کی غفلت۔ جاپان کو ایشیا کا لیڈر ہونا چاہئے تھا۔ وہ چین کو برباد کرنے میں مصروف ہے۔ ہندوستانی مسلمان مذہب پسندی کا مدعی ہے لیکن اپنے ہم مذہب کو پیٹ کی خاطر غلام بنانے پر مجبور رہے۔ میرا انصاری محمد علی اور دیش بندھو داس کا مشورہ یہ ہے کہ اہلِ جاپان اور ہندی مسلمان کی ذہنی تربیت پر زور دیا جائے تاکہ جاپان ایشیائی اقوام سے مل کر جدوجہد کرے اور ہندی مسلمان، ہندو سے مل کر آزادی کی تحریک میں حصّہ لے۔

بزرگ نے پھر شہید انور بے کو پکارا۔ انور کے چہرے پر شہادت کا نور چمکتا تھا اُٹھا اور کہا کہ "میں نے ساری عمر اسلام کی سربلندی میں صرف کی ہے۔ دنیا کے مسلمان کو میرا یہ پیغام دیں کہ وہ

جس ملک کا باشندہ بھی ہو وہاں اس سے اس کثرت سے نیک افعال سرزد ہوں کہ وہاں کے غیر مسلم باشندے اسے ملک کا محسن اور بنی نوعِ انسان کا خدمتگزار سمجھیں۔ اسلامی تسلط کے عجمی مفہوم سے قطع نظر کر کے خدمت اور قربانی کی اساس و بنیاد پر قوموں اور ملکوں میں امتیازی جگہ حاصل کرنا چاہئے۔"

بزرگ "۔ میں نے آپ کے احساسات و خیالات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے، میں مسلمانوں میں ایک خوشگوار انقلاب دیکھ رہا ہوں لیکن مجھے جاپان میں مشکلات کا سامنا ہے۔ خیر خدا ہر دن ایشیا اور ہندوستان کے لئے بہتر اور مبارک بنا رہا ہے۔ عزیزو! مجھے رخصت دو کہ مجھے ٹوکیو میں اسی سلسلہ میں ضروری کام ہے۔"

اس بزرگ کے احترام میں سب کھڑے ہو گئے۔ وہ سب سے رخصت ہو کر اندرما شہزادی اور محسن کو ساتھ لے کر وہاں سے چلا۔ چند قدم چل کر کہا عزیزو آنکھیں بند کر لو۔ محسن نے آنکھیں بند کر لیں اندرما اور شہزادی نے از راہ تجسس آنکھیں کھولے رکھیں۔ دونوں نوجوان لڑکیوں کو معلوم ہوا کہ دنیا ان کے گرد گھوم رہی ہے۔ ان کا سر چکرا گیا وہ بے ہوش سی ہو کر زمین پر گر گئیں۔ انہیں ہوش آیا تو اندرما نے دیکھا کہ اسے وہ بزرگ سنبھال کر جائے قیام کے کمرہ

میں پلنگ پر لٹا رہا ہے اور شہزادی نے محسن کو دیکھا کہ سہارا دے کر اسے آرام کرسی پہ لٹا رہا ہے۔

بزرگ نے دونوں کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا خیریت ہوگئی فکر نہ کرو یہ تمہارے تجسس کی سزا ہے۔ عورت کی یہ کمزوری ہے کہ ہر بات کی ٹوہ میں لگی رہتی ہے۔ آنکھیں بند رکھتیں تو اتنی بھی تکلیف نہ ہوتی۔ دُور کی دنیا کا سفر جب آنکھیں کھول کر چند سیکنڈ میں طے کیا جائے تو سر کا چکرانا قدرتی امر ہے۔ کہا لڑکیو! اب تم دونوں کو آرام ہے۔

اندرا اور شہزادی دونوں نے سنبھل کر کہا۔ اب بالکل آرام ہے۔

بزرگ نے کہا کہ لو خدا حافظ میں مناسب وقت پر پھر ملوں گا۔

دونوں لڑکیوں کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ اے پُراسرار بزرگ آپ کون ہیں ؟

بزرگ۔ مَیں کون ہوں۔ خدا کے بندوں میں سے ایک عاجز بندہ تم نے دو دفعہ پہلے استفسار کیا۔ مَیں نے جواب دیا میرے متعلق تمہارا یہ تیسرا استفسار ہے ۔ رازوں کی ٹوہ میں لگے

رہنے والوں کی صحبت میں مجھے زیادہ دیر ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ میری ذات کے متعلق تمہارے استفسار کا تیسرا موقعہ ہے۔ ایسا ہر تیسرا موقعہ ہمیشہ پیغام جدائی ثابت ہوا ہے۔ اتنے میں بزرگ کا رنگ زرد ہو گیا۔ اب معلوم ہوا گویا اسکا دل ڈوب رہا ہے۔ وہ آرام کرسی پر گر گیا۔ شہزادی محسن اور اندرما بیتاب ہو کر دریافت حال کرنے لگے۔ اُس نے ہاتھ کے اشارہ سے تسلی دی۔ تھوڑی دیر کے بعد طبیعت بحال ہونا شروع ہو گئی۔

"بچو!" اُس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "مجھے ہمیشہ کے لئے تم سے جدا ہونے کا حکم آ گیا"۔

"حکم کس کا بابا!" شہزادی نے بے تابی سے کہا۔

"اب میں صرف ایک سوال کا ہی جواب دے سکتا ہوں۔ غیر ضروری سوالات سے موقع ضائع نہ کرو"۔

اندرما نے کہا۔ تو فرمائیے بابا مسلمانوں کو سیاسیات ہند میں پیش پیش کیسے لایا جا سکتا ہے۔

جواب سے پہلے وہ اس امر کا اطمینان کر لینے کے لئے رکا کہ آیا اس سوال پر تینوں کا اتفاق ہے۔

"میں تمہارے خیالات سے خوب واقف ہوں لیکن یہ یاد

رکھو مشترکہ سیاسی ذہن جو مشترکہ سیاسی تنظیم کا خالق ہو تدریج پیدا ہو گا۔ یہ عمل گرم حلوا ہے۔ جو جھٹ اُٹھا کر منہ میں ڈالے گا تکلیف اُٹھائے گا۔ اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ اکثریت یہ اعلان کرے کہ مشترکہ سیاسی تنظیم سے مقصد حصول آزادی ہے مشترکہ مذہب اور تہذیب نہیں۔ مسلمانوں کے پرسنل لا کی حفاظت کے لئے ہر جگہ قاضی کے تقرر کو قبول کیا جائے۔ ہندوستان کی خارجہ پالیسی خالصتہً بین الاسلامی مفاد کے ماتحت رکھے جانے کا مسلمانوں کو یقین دلایا جائے۔ اس کی بہترین تجویز یہ ہے کہ بحالات موجودہ اسلامی جماعتوں اور مسلمانوں کے احساسات کے پیش نظر بین الاسلامی سیاسیات میں ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے اور منصفانہ دباؤ ڈالنے میں کوتاہی نہ کی جائے۔ پھر قابل قبول آئین کے نفاذ کے ساتھ وزارت خارجہ کا قلمدان مسلمان وزیر کے سپرد کیا جائے مرکزی حکومت میں ہر حال میں اس کا تیسرا حصہ معین کر کے اسکے اطمینان کے مطابق اس کی سیاسی اہمیت تسلیم کر لی جائے۔

اس کے باوجود بھی احرار اسلام کی ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے، جو آزادی کی طالب اور فرقہ دارانہ امن کی خواہاں ہو۔ اس کے رجحانات مشترکہ تنظیم کی طرف ہوں۔ تاکہ وہ مسلمانوں کی سیاسی

تربیت کرکے پس ماندہ مسلمان کو آگے لانے کی کوشش بھی کرے اور ساتھ ہی مسلمان ملک کے مشترکہ مفاد کے خلاف غیر ملکی سازشوں کا شکار نہ ہوسکیں۔

یاد رکھو کہ اقلیت ہر جگہ غیر مطمئن متشکک اور متردّد ہوتی ہے۔ وہ ہوا میں خطرے کی بو سونگھتی ہے۔ اور اپنی ہستی کے خلاف ہوم سازشوں کا جال بچھا دیکھتی ہے۔ رفع شک کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے علاوہ بھی احرار اسلام کو یہ رعایت دینی چاہئے کہ وہ ملک کی مشترکہ تنظیم میں شمولیت کے باوجود اس امر کی حقدار ہو کہ اسے تمام مسلمانوں کی آواز سمجھا جائے۔ اور جب تک ہندو مسلمانوں کی سیاسی تربیت بہتر ہو کر ملک میں مستقلاً بہتر حالات پیدا نہ ہو جائیں تب تک اسکی علیحدہ ہستی تسلیم کی جائے تا آنکہ ملک کی خوشگوار فضا خود بخود اسکی ضرورت کو باقی نہ رکھے

اگر سیاسی پارٹیاں اقتصادی بنیادوں پر تعمیر کی جائیں تو معاملہ اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ یہ اقتصادی پارٹیاں مذہب و تہذیب کو مٹا دینے کی داعی نہ ہوں۔ مسلمان جدید اقتصادی نظریوں کو بہت جلد قبول کر سکتا ہے۔ یہ اسکے مزاج اور تعلیم کے عین مطابق ہیں اسے یہاں بھی مشکل ہے تو یہی کہ اقتصادی انصاف اور انسانی مساوات کے بزدل اور عیاش مبلغ کو مسلمان خدا مذہب اور اخلاق کے خلاف

صف آرا دیکھتا ہے۔

ان متذکرہ خدشات کو دور کئے بغیر دباؤ اور لالچ سے اگر کام نکالنے کی سعی کی گئی تو ہندوستان بارود کا خشک ڈھیر ثابت ہو گا۔

تمہاری طرح مسلمان کو میری نصیحت ہے کہ قربانی اور خدمت کی بنا پر ملک میں نمایاں ہونے کی کوشش کرو۔ ہندو کیلئے میرا پیغام ہے کہ وہ اپنے معاشرتی طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرے۔ اور دونوں قومیں حصولِ آزادی پر نگاہ رکھیں۔ افسوس ہندوستان میں ابھی وہ سیاسی تربیت پیدا نہیں ہوئی جو مستقل امن کی ذمہ دار ہے۔ میں تم جیسے پاک ارادوں کی پرورش کرنے والوں کے لئے بھی مستقبل قریب میں خطرے دیکھتا ہوں۔

لو بیٹا۔ الوداع اس دنیا میں نہیں کسی اور عالم میں جلدی ملیں گے"

تینوں نے دیکھا کہ اس بزرگ کے گرد ایک روشن ہالہ نمودار ہو کر چکر کاٹنے لگا۔ اور وہ بزرگ پل بھر میں مجسمۂ نور بن گیا پھر اس کا پیکرِ نور ہوا میں کافور ہو گیا۔ اور وہ تینوں آئینہ کی طرح حیران ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

اس واقعہ کو کئی دن گذر گئے۔ اندرما نے چاہا کہ سیاسیات کے ریگستان سے نکل کر محبت کی جگمگاتی اور جاگتی وادی میں داخل ہو اور ہر طرف بکھری ہوئی رعنائیوں کا نظارہ کرے۔ اُس نے مسکرا کر شہزادی

اور محسن کی طرف دیکھا۔ اور معصوم ادا سے شہزادی کو مخاطب کر کے پوچھا۔

حسن و عشق کو دنیا کب شیر و شکر دیکھے گی

اندرما رسم مناکحت کی طرف اشارہ کرنے کو تو کر گئی۔ اپنی عمر اور موضوع گفتگو میں نامناسبت سی پاکر خود محجوب ہو گئی محسن اور شہزادی نے ایک دوسرے کو دیکھ کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ تاہم دونوں اس جہاں میں جا نکلے جہاں تشنہ آرزوئیں شراب خوشگوار کو جام زریں میں چھلکا رہی تھیں۔ جہاں شام عیش و نشاط کا پیام لے کر آتی۔ اور صبح مسرتوں کی آغوش میں مسکراتی اُٹھتی تھی۔

موت

معلوم نہیں کہ وہ زریں خوابوں کی ایسی خوبصورت بستی میں کب تک رہتے لیکن اچانک سات آدمی اندرما کی طرف جھپٹے۔ اور اسے زبردستی گھسیٹتے لے چلے محسن راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ان میں سے تین نے اس پر قابو پانا چاہا لیکن وہ ان کے انداز سے زیادہ طاقتور اور چابک دست تھا۔ تینوں کو نیچے گرا کر وہ اندرما کو چھڑانے کے لئے بڑھا۔ ایک ہنگامہ سا ہو گیا۔ حملہ آوروں نے خنجر نکال کر پہلے ڈرایا محسن مسکرایا۔ شہزادی نے جھپٹ کر ایک کے ہاتھ

سے خنجر چھین لیا۔ حملہ آوروں نے محسن پر اوچھا سا وار کیا۔ تاکہ وہ معاملہ کی نزاکت کو سمجھ کر جان جوکھوں میں نہ ڈالے۔ لیکن اُس نے پرواہ نہ کی اور اندرما کو زبردستی چھڑا لیا۔ شکاریوں ہاتھ سے جاتا دیکھ کر وہ گالیاں دیتے ہوئے محسن پر ٹوٹ پڑے۔ خنجر سے پیٹ اور پشت پر وار کیا۔ محسن لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ اندرما کو وہ پھر لے چلے۔ شہزادی نے خنجر کا ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ وہ بھی زمین پر لوٹنے لگا۔ باوجود مہلک زخم کے محسن پھر اُٹھا لیکن حملہ آور ٹوٹ پڑے۔ وہ وہیں رہا شہزادی لپک کر محسن کو بچانے آئی۔ وہ بھی کاری زخم کھا کر گری۔ شہزادی اور محسن کا کام تمام کر کے وہ بے ہوش اندرما کو اٹھا کر لے چلے۔ اگرچہ کچھ لوگ مدد کو پہنچے۔ لیکن جانبازی کا کام سمجھ کر کسی نے ہاتھ نہ ڈالا۔

اندرما کو جب ہوش آیا تو اُس نے اپنے آپ کو تھانہ پولیس میں پایا۔ گھبرا کر پوچھا کہ شہزادی اور محسن کا کیا حال ہے! افسر انچارج نے کہا کہ تمہارے ساتھی جانبر نہیں ہو سکے۔ صدمے سے اس کا دل پھر ڈوب گیا۔ پولیس افسر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ موت کی خبر سنا کر اُس نے کوئی خدمت انجام نہیں دی۔ مبادا اس کی حالت زیادہ خراب نہ ہو جائے۔ اندرما کو سول ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ جہاں دوسرے

روز اس کی طبیعت قدرے سنبھلی - اسکے دو روز بعد جب طبیعت پورے طور پر بحال ہو گئی - تو اُسے معلوم ہوا کہ ہسپتال زخمیوں سے بھر گیا ہے - نرس سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ تمہارا زبردستی اغوا ہندو مسلم فساد کا باعث بن گیا ہے - ہندو یہ سمجھے کہ تم ہندو ہو - اور مسلمان تمہیں اغوا کئے پھرتے ہیں - مسلمان اب سمجھتے ہیں کہ تم مسلمان لڑکی ہو ہندو تمہیں اٹھا کر لے گئے ہیں - شہر میں قیامت بپا ہے - مسلمان ہندو سرمایہ داروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلاک کر رہے ہیں - ان کا خیال ہے کہ تمہیں اُٹھانے والے اور تمہارے رسیا دل کو قتل کرنے والے بھی ہندوؤں کے مسلمان ملازم تھے

نرس یہ کہہ کر کمرہ سے باہر چلی گئی - اندرا اٹھی اور بغیر اطلاع ہسپتال کو چھوڑ کر شہر میں آ گئی - سب دوکانیں بند تھیں - وسط شہر میں ہنگامہ ہو رہا تھا ہندو مسلمان جوش سے بھرے ایک دوسرے سے الجھ کر دادِ شجاعت دے رہے تھے - سب پر عام دیوانگی طاری تھی - جہاں گھمسان کا معرکہ جاری تھا - اندرا وہاں گھس گئی - ہجوم کے بیچ کھڑی ہو کر انسانیت کا واسطہ دیکر سمجھانے لگی -

جہاں جذبات برہنہ ہو کر ناچیں وہاں عقل روپوش ہو جاتی ہے اسکی دانائی کی باتوں کو نادانوں نے نہ سنا - وہ نوالٹا اسی پر پتھر برسانے

لگے۔ اس کے سر پر کئی چوٹیں آئیں۔ وہ گری مگر پھر سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ دل میں کہا ہندو مسلم آویزش غلامی کی نشانی ہے۔ آزادی ہی اس مسئلہ کا حل ہے۔ اتنے میں ایک پتھر دل پر لگا۔ وہ پہلے ہی کمزور ہو گئی تھی۔ یہ چوٹ زندگی کا فیصلہ کرنے والی ثابت ہوئی۔ آنکھوں کے سامنے موت کی تاریکی کا گہرا پردہ آگیا۔ پھر وہ اس تاریکی سے نکل کر آخرت کی زندگی کی روشن دنیا میں چلی گئی۔ سفر آخرت میں بھی یہ یقین لے کر چلی کہ ہندوستان بھی ایک دن ناامیدی کے اندھیرے سے نکل کر امید و آزادی کی روشن شاہراہ پر پہنچ جائیگا۔

عبرت نے افسردہ ہو کر گردن جھکالی اور مایوس ہو کر کہا جس ملک میں ایسے فرشتہ خصلت لوگ ناکردہ گناہ قتل ہو جائیں۔ اس کا انجام کیا ہوگا۔

وجدان نے کہا ایسے پاک لوگ جب قوم کی بیوقوفی کی بھینٹ ہو جائیں تب ہی اہل ملک میں شرمندگی کے بعد شعور پیدا ہوتا ہے۔ جب پاکباز لوگ فتنوں کو دباتے موت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ تو عقل کو ترکہ میں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہند والوں کو جب خدا مل بیٹھنے کی عقل دیگا۔ وہ انکی غلامی کا آخری دن ہوگا۔ ہندوستان کی آزادی کسی جنگی پروگرام پر اتنی منحصر نہیں جتنی ہندو مسلمانوں کے بہتر تعلقات پر۔ ایسی ہی بے لوث قربانیاں بالآخر نجات کا راستہ دکھاتی ہیں۔ اور آزادی کا گر سکھاتی ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کا گر سہل اور آسان ہے۔ کہ

"متحد ہو جاؤ اور آزادی حاصل کرلو"

افضل حق

754/2 2nd 21/12

Hasan Shah
Farouki